Date of Publication : 16-08-2014

PRICE Rs. 2/-

POSTED ON 17-18 August 2014
R.N.I No. 2186/57

POSTAL REGN. NO. DL (C) -01/1195/2012-14
Licensed to Post Without Prepayment U(C)160/2012-14

HAMARI ZABAN (WEEKLY)

ہفت روزہ

ہماری زبان

انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی

22-28 August 2014
Issue: 32, Vol.:73

۲۲ تا ۲۸ راگست ۲۰۱۴ء
شمارہ نمبر: ۳۲، جلد نمبر: ۷۳

سرزمین ہندوستان میں جموں و کشمیر کو اس وجہ سے بھی اہمیت حاصل ہے کہ اس ریاست نے آزادی کے بعد جہاں اردو زبان و ادب کو اپنے علاقے کی سرکاری زبان کی حیثیت سے قبول کیا ہے وہیں اس زبان و ادب کی ہمہ جہت ترقی و ترویج کے لیے عملی اقدام بھی انجام دیے ہیں۔ تاہم آزادی کے بعد جس تیز رفتاری کے ساتھ جموں و کشمیر کے تمدن سے اس علاقے کے علمی و ادبی کارناموں کو نمایاں مقام حاصل ہونا تھا وہ اس لیے ممکن نہ ہوسکا کہ اس علاقے کے سیاسی، سماجی اور معاشی حالات میں ابتری پیدا ہوگئی تھی، لیکن حالات بہت جلد سنبھل گئے اور اب صورت حال حد درجہ امید افزا ہے۔ تین جغرافیائی خطوں پر مشتمل

دراصل اس عہد میں ڈوگری، پنجابی سے گہرا لسانی رشتہ رکھنے کی بنا پر اردو سے بھی قریب تھی۔ چناں چہ اہل جموں کو اردو سیکھنے میں زیادہ دقتوں کا سامنا نہیں کرنا پڑتا تھا، کیوں کہ اردو کا پنجابی لہجہ ڈوگروں کے لیے نامانوس نہیں تھا۔ چناں چہ مہاراجہ رنبیر سنگھ کے دور حکومت (1857-85) ہی سے جموں میں اردو کے لیے سازگار ماحول قائم ہونے لگا تھا۔ مہاراجہ کو تعلیم کی ترویج و ترقی اور علوم و فنون سے بے حد رغبت تھی۔ ان کے دربار سے جو علما و فضلا وابستہ تھے وہ سب اردو سے واقف تھے۔ ان میں دیوان کرپارام، غوث محمد ہشیار پوری، پنڈت رام کرشن وغیرہ کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ مہاراجہ رنبیر سنگھ نے سنسکرت کی کتابوں اور مخطوطات پر مبنی ایک کتب

پہلی قسط

ریاست جموں و کشمیر میں اردو زبان کی اہمیت اور مستقبل

ڈاکٹر دلجیت ورما (ایسوسی ایٹ پروفیسر ویمنز کالج، گاندھی نگر، جموں [جموں و کشمیر])

ریاست جموں و کشمیر کا قیام مہاراجہ گلاب سنگھ کے دور حکومت (1846-56) میں اسی وقت عمل میں آیا جب ۱۶ مارچ ۱۸۴۶ کو امرتسر معاہدے کے تحت انھوں نے انگریزوں سے جموں اور کشمیر پر حکومت کرنے کا اختیار حاصل کیا۔ لداخ کا علاقہ پہلے ہی ان کی تحویل میں تھا۔ ڈوگروں کی یہ حکومت ایک صدی سے بھی زائد عرصے تک قائم رہی۔ ڈوگرہ حکمرانوں کے عہد سے پہلے یہاں افغانوں اور سکھوں کے دور میں فارسی زبان و ادب کا چلن تھا۔ ڈوگرہ دور حکومت میں ریاست کا بیشتر سرکاری کام فارسی میں ہوتا تھا اور ساتھ ہی ساتھ ڈوگری کی سرپرستی بھی کی جارہی تھی۔ لیکن انیسویں صدی میں شمالی ہندوستان میں اردو کے عروج اور فارسی کے انحطاط پذیر صورت حال کا اثر ڈوگروں کی لسانی حکمت عملی پر بھی پڑا۔ علاوہ ازیں ڈوگروں کے شمالی ہندوستان کے درباروں کے ساتھ گہرے روابط تھے، ہندوستان کے شمالی علاقوں سے مختلف امور کے سلسلے میں جو لوگ جموں آتے تھے وہ اردو میں ہی بات چیت کرتے تھے۔

خانہ قائم کیا اور ایک دارالترجمہ کی بنیاد بھی ڈالی جہاں اردو سمیت دوسری ریاستی زبانوں کو جدید علوم سے روشناس کرانے کے لیے ترجمے کا کام انجام دیا جانے لگا۔ دارالترجمے کے ناظم پنڈت گوبند رام کول اور صدر مفتی رشید الدین مقرر ہوئے۔ ان کے علاوہ اس میں دیگر بہت سے مذہبی، سیاسی، لسانی اور ادبی دانشور، عالم و فاضل بھی کام کرتے تھے۔

ریاست میں پہلا پرنٹنگ پریس ۱۸۵۸ء میں سرمائی راجدھانی جموں میں قائم ہوا اور یہاں فارسی اور سنسکرت کی طرح اردو میں بھی کچھ سرکاری فارم اور دستاویزات چھپنے لگے۔ اس کے کوئی دس سال بعد 'وکرم بلاس' اور پھر 'بدیا بلاس' پریس قائم ہوئے۔ ۱۸۸۲ء میں 'بدیا بلاس' ہی کے نام کا ایک اخبار شائع ہونا شروع ہوگیا جس میں ایک حصہ دیوناگری اور ایک اردو رسم الخط میں رقم ہوتا تھا۔ یہ ریاست میں صحافت کی شمع روشن کرنے کا پہلا زینہ تھا، جس نے بعد میں سیکڑوں چراغ جلادیے اور ساری ریاست اس کی روشنی سے جگمگا اٹھی۔ غرض اس عہد میں اردو نے ریاست میں اپنے قدم جمالیے

تھے۔ مہاراجہ کی علم دوستی اور علم پروری کا چرچا سن کر پنڈت ہرگوپال کول خستہ اور ان کے بھائی پنڈت سالگ رام کول سالک دہلی کا قیام ترک کرکے اپنے آبائی وطن کشمیر لوٹ آئے۔ ان دونوں بھائیوں کا اس دور کے صف اول کے ادبا و شعرا میں شمار ہوتا تھا۔ ان دونوں کو نظم و نثر کے علاوہ صحافت سے بھی دل چسپی تھی۔ ریاست جموں و کشمیر میں اردو کی ترقی و ترویج میں ان دونوں کا قابل قدر حصہ ہے۔ پنڈت ہرگوپال کول خستہ اپنی خداداد صلاحیتوں کی بنا پر ۱۸۷۲ء میں مہاراجہ رنبیر سنگھ کے دربار سے وابستہ ہوگئے اور کئی نثری کارنامے انجام دیے جن میں 'گلدستۂ کشمیر' اور 'گلزار فوائد' اہم تصانیف ہیں۔ اسی دور میں برطانوی گورنمنٹ نے مداخلت کرکے کشمیر میں پہلی بار اپنا وائسرائے کا ایجنٹ مقرر کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اردو کو مزید ترقی کرنے کا موقع مل گیا کیوں کہ اردو ہی کو رابطے کی زبان کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ مہاراجہ رنبیر سنگھ کے جانشین

مہاراجہ پرتاپ سنگھ (1885-1925) کا دور حکومت اردو کی ترقی کے حوالے سے اہم رہا۔ انھوں نے اردو کی اہمیت اور مقبولیت کو مدنظر رکھ کر ۱۸۸۹ء میں فارسی کی جگہ اردو کو ریاست کی سرکاری زبان کا درجہ دے دیا۔ اس طرح پوری ریاست میں اردو زبان کی اشاعت اور فروغ کی راہیں کھلنے لگیں۔ بیسویں صدی کے وسط تک ریاست جموں و کشمیر میں تعلیمی، ادبی، صحافتی اور سیاسی غرض ہر سطح پر اردو زبان کا ایک اہم اور واضح رول متعین ہوچکا تھا اور اس نے ریاست کی مختلف لسانی اکائیوں کے درمیان لنگوا فرانکا (Linguafranca) کا درجہ بھی حاصل کرلیا تھا۔ چناں چہ آزادی کے بعد جب ۱۹۵۲ء میں ریاست کا آئین منظور کیا گیا تو ریاستی قانون ساز اسمبلی نے اردو کی غیر معمولی عوامی مقبولیت کے پیش نظر اس کو سرکاری زبان کا درجہ دینے کی توثیق کی۔

ریاست جموں و کشمیر چوں کہ ایک کثیر لسانی علاقہ ہے، اس کی تین بڑی

اکائیاں جموں، کشمیر اور لداخ ہیں۔ یوں تو ان تینوں خطوں میں بالترتیب ڈوگری، کشمیری اور لداخی بولی جاتی ہے مگر ان کے علاوہ یہاں کے طول و عرض میں اردو، ہندی اور پنجابی جیسی بڑی زبانوں کے چلن کے ساتھ ساتھ گوجری، بلتی، پہاڑی، پوگلی، شینا، رام بنی، بھدرواہی، کشتواڑی، سراجی، بھلیسی، کھشالی، پاڈری، چمیالی اور پنگیالی وغیرہ چھوٹی چھوٹی بولیاں بھی مروج ہیں اور یہاں بولی جانے والی تمام زبانیں اپنے اپنے علاقوں تک محدود ہیں۔ نیز ان کا دائرۂ اثر دوسرے علاقوں تک نہ ہونے کے برابر ہے، اس لیے کسی ایک علاقے کو دوسرے علاقوں پر لسانی اور سیاسی برتری حاصل نہ ہو ایک بہتر منصوبے کے تحت اردو زبان کو اس منصب سے سرفراز کیا گیا لیکن انگریزی زبان کے استعمال کی گنجائش بھی واضح طور پر رکھی گئی۔ اس سلسلے میں ریاستی آئین کی دفعہ 145 کے تحت یہ الفاظ درج ہیں:

" The official language

of the state shall be Urdu but the English language shall unless the legislature by law provides, continue to be used for all the official purposes of the state for which it was being used immediately before the commencement of this constitution."

غرض ریاست جموں و کشمیر میں اردو کسی علاقے کی مادری زبان نہیں ہے لیکن یہ زبان اہل ریاست کے لیے اجنبی بھی نہیں ہے۔ اس لیے اسی کو سرکاری زبان کا درجہ دینے میں حکومت نے بہتر سمجھا۔ نیز اردو کے ساتھ انگریزی زبان کے استعمال کی گنجائش رکھنا بھی ان کی دور اندیشی کا مظہر ہے۔

اردو زبان عصر حاضر میں تخلیقی اور صحافتی اظہار کا سب سے اہم اور مقبول وسیلہ ہے۔ چناں چہ بیشتر مقامی ادبا اور شعرا جہاں اپنی مادری زبانوں کو ادبی اظہار کا وسیلہ بنا رہے ہیں، وہیں اپنی تخلیقات کو زیادہ سے زیادہ قارئین تک پہنچانے کے لیے اردو کو ترجیحی طور پر استعمال کرتے ہیں۔ صحافت اور ماس میڈیا کے دوسرے وسائل کا جہاں تک تعلق ہے ان میں اردو کو نمایاں اور اعلا مقام حاصل ہے۔ اخباروں کی ایک کثیر تعداد اردو میں چھپتی ہے اور یہ اخبارات ریاست کے کونے کونے تک پہنچتے ہیں اور دل چسپی کے ساتھ پڑھے جاتے ہیں۔ ریاست میں اردو کی اشاعت اور تشہیر میں شروع سے ہی ان اخبارات کا ایک اہم کردار رہا ہے۔ پچھلے تین پچیس برسوں میں اردو اخبارات کی کثیر اشاعت سے عوامی سطح پر اردو کی مقبولیت میں اضافہ ہوا ہے۔ عوام کے ساتھ جڑے رہنے سے ان اخبارات کا معیار بھی بہت بڑھ گیا ہے۔

ریڈیو اور ٹیلی ویژن نے بھی اردو کے فروغ میں قابل قدر کام کیا ہے۔ ان اداروں نے ریاست میں ایک بہتر رابطے کی زبان کے طور پر اردو کی عوامی بنیادیں مستحکم کرنے میں نمایاں خدمات انجام دی ہیں اور آج بھی اس سلسلے میں ان کا ایک اہم اور موثر رول ہے۔ ۱۹۵۴ء میں جب ریاست میں ریڈیو کشمیر کے نام سے الیکٹرانک میڈیا کا آغاز ہوا تو اُس وقت ایک پالیسی واضح کی گئی تھی کہ اس ادارے کے پچھتر فیصد پروگراموں کی زبان اردو ہوگی مگر اس پالیسی پر پوری طرح عمل نہیں کیا جا رہا ہے۔ محکمۂ اطلاعات اور جموں و کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لنگویجز بھی اردو کی ترقی کے سلسلے میں پیچھے نہیں ہیں۔ ان دونوں اداروں نے ماضی قریب میں دوسری سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ اردو زبان و ادب کی ترقی میں بھی قابل ذکر خدمات انجام دی ہیں۔

۱۹۵۰ء میں جب مہاراجہ ہری سنگھ نے عنان حکومت سنبھالی تو انھوں نے بھی اردو کو سرکاری زبان بدستور برقرار رکھا۔ اس عہد میں بھی کئی انجمنیں اور ادارے قائم کیے گئے جنھوں نے اردو کے فروغ میں اہم رول ادا کیا اور آج بھی کر رہے ہیں جس کی بدولت اس زبان نے اپنے ارتقائی مدارج بہت تیزی سے طے کیے۔

(باقی آئندہ)

❖❖❖

مشتاق احمد یوسفی

پہلی قسط

مشہور و ممتاز ادیب غلام رضوی گردش کا مشتاق احمد یوسفی پر یہ خاکہ نما مضمون بہت اہم اور دل چسپ ہے، جو اُن کے خاکوں کے مجموعے 'دیار خوش نفساں' میں شامل ہے، جسے ہم یہاں گاہے گاہے بازخواں کے طور پر نقل کر رہے ہیں۔ (ادارہ)

یوسفی نے اپنی شوخی گفتار سے بڑے ستم ڈھائے ہیں لیکن اسکاٹ لینڈ اینڈرسن نے ان کی بھی بولتی بند کردی۔ اصفہانی کے کہنے پر اس کی خدمت میں بینک کی ملازمت کے لیے درخواست پیش کردی۔

"بائی دی وے، جس سال تم پیدا ہوئے، اسی سال میرے باپ کا انتقال ہوا، بڑا منحوس تھا وہ سال!" پھر یوسفی کی ناک کی خمیدہ ہڈی دیکھ کر وہ بہت ہنسا۔

"تمھارا ایک کان بھی ٹیڑھا لگا ہوا ہے!"

ابھی سنبھلنے بھی نہ پائے تھے کہ پھر بولا "تمھاری صورت منٹو سے کتنی ملتی ہے!" "ذرہ نوازی کا شکریہ!" چہک کر کہا۔ "مجھے اس بامنزہ کی صورت سے نفرت ہے!" بس ساری شوخی دھری رہ گئی۔

ٹونک (راجستھان) میں بڑے کنویں کے سامنے یوسفی کی آبائی حویلی میں والیِ ریاست ہز ہائینس سر ابراہیم علی خاں کے درجنوں فوٹو آویزاں تھے۔ یوسفی کے والد نے ہر ایک کی ناک چاقو سے چھیل دی تھی۔ ان کا عقیدہ تھا کہ شبیہ مکمل ہو تو گھر میں رحمت کے فرشتے نہیں آتے۔ ایک گروپ فوٹو خانے کی زینت تھا۔ اس کی بھی وہی درگت بنی تھی۔

ہم دیکھتے ہیں یوسفی کی کسی کتاب میں ان کا فوٹو شامل نہیں۔ ممکن ہے سوچتے ہوں "نکٹی تصویر" شائع کروانے سے فائدہ؟

والد چاقو سے ناک چھیلتے تھے۔ یہ فریضہ وہ نوک قلم سے انجام دیتے ہیں۔ چناں چہ یونائیٹڈ بینک لمیٹڈ کے اسٹیج پر ہمیں جتنے بھی کردار جلوہ گر نظر آتے ہیں ان کے بارے میں خواہ وہ کچھ بھی کہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ سیف الملوک خان، غفران اللہ خان، چاچا فضل دین اور عالم صاحب کے علاوہ سب کی ناک یوسفی نے بڑے سلیقے سے چھیلی ہے اور سب کے سب ہمیں نکٹے نظر آتے ہیں۔

'چراغ تلے' میں یوسفی اپنا حلیہ یوں بیان کرتے ہیں: "اپنے آپ پر پڑا ہوں۔ پیشانی اور سر کی حد فاصل اُڑ چکی ہے۔ لہٰذا منہ دھوتے وقت یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ کہاں سے شروع کروں۔ ناک میں بذاتہ تعلیٰ کوئی نقص نہیں ہے مگر بعض دوستوں کا خیال ہے کہ بہت چھوٹے چہرے پر لگی ہوئی ہے۔" پھر 'زرگزشت' میں معترف ہیں کہ یہ ایک عام آدمی کی کہانی ہے جس پر کسی بڑے آدمی کی پرچھائیں تک نہیں پڑی، لیکن:

"بعض مشاہیر کے جن چیدہ چیدہ اوصاف اور شباہتوں کا اپنی ذات میں ہنگسا نظر آیا کاش وہ نہ ہوتیں تو زندگی سنور جاتی، مثلاً نپولین کا قد، جولیس سیزر کا چٹیل سر، جینا لولو برجیڈا کا وزن، سیموئل جانسن کی بینائی، ناک بالکل قطب طرہ کی مانند کہ اگر وہ انچ بھی چھوٹی ہوتی تو اس دنیا کا نقشہ بدصورتوں میں اور اپنا خوب صورتوں میں ہوتا"

دیکھیے، بڑی چابک دستی سے اپنا سراپا بیان کر گئے لیکن قابل غور بات یہ ہے کہ پہلے موصوف کو اپنی جو ناک صحیح سلامت معلوم ہوتی تھی اب اسی میں انھیں کیڑے نظر آنے لگے، یعنی اتنے دنوں بعد اپنی ناک نوک قلم سے چھیلنے کا شوق چرایا۔

مسکراتے وقت یوسفی کے لب خمیدہ رہتے ہیں لیکن ان کی نگاہیں بھی نہیں جھکتیں۔ صدر مملکت خداداد کے سامنے بھی نہیں، بلکہ مخاطب کے وجود میں ہمیشہ پیوست رہتی ہیں!

کچھ کرم کو ستوانی، ٹونک (راجستھان) میں پیدا ہوئے جہاں دین اور شاعری کا بڑا چرچا تھا۔ لڑکیوں کی طرح صحیح عمر بتانے سے گریز کرتے ہیں لیکن اغلب ہے کہ ۱۹۲۹ء کے آس پاس پیدا ہوئے۔ تیسری جماعت تک ٹونک میں تعلیم حاصل کی اور پھر جے پور میں اندرون سانگانیری گیٹ منتقل ہوئے۔ والد ریاست ٹونک میں سکریٹری تھے لیکن ریاستی نام جہام سے محترز، پابند شرع اور سود لینے کو قطعاً حرام سمجھنے والے۔ مقبولاً حیدرآباد پر اسمبلی میں ایک تقریر کے بعد باد مخالف کچھ ایسی چلی کہ ہجرت مقدر ٹھہری!

فرزند ارجمند یوسفی کا کیا کہنا۔ ابتدائی ڈریک، نہایت شاندار اکیڈمک ریکارڈ، ہائی اسکول سے ایم اے (فلسفہ) اور ایل ایل بی تک ہر امتحان میں فرسٹ ڈویژن۔ انٹرمیڈیٹ، بی اے اور ایم اے میں فرسٹ پوزیشن بھی! پھر سول سروس کے امتحان میں نمایاں کامیابی

غلام رضوی گردش

حاصل کرنے کے بعد تین برس ڈپٹی کمشنر رہے لیکن نوشتۂ تقدیر کچھ اور ہی تھا۔ ایک دن اچانک کوچ کی سوجھی اور ۳۱ دسمبر ۱۹۴۹ء کو بے پورے روانگی کے بعد منابا دے کھوکھراپار تک کا سرحدی علاقہ اونٹ کے کوہان پر بیٹھ کر طے کیا۔ بالآخر اس ارض موعود پر قدم رکھا جس کے بارے میں سوچ رکھا تھا کہ وہاں ہر شخص کباب پراٹھے کھاتا ہوگا۔

القاں وخیزاں کراچی پہنچے۔ پہلا مسئلہ رہائش کا تھا۔ پیر الٰہی بخش کالونی میں 12X12 کے دو کمروں پر قبضے کے لیے ساڑھے تین سو روپے پگڑی دینی تھی۔ ماہانہ کرایہ 35 روپے تھا۔ سرچا کیا نہ کرتا، اس رقم کی فراہمی کے لیے کرتے میں لگے سونے کے بٹن فروخت کر دیے۔

جوں توں یونائیٹڈ بینک میں ملازمت بھی مل گئی، لیکن ماں بیوی اور چار بچوں کی کفالت کرنا پڑتی۔ قلیل تنخواہ، اس پر حد درجہ مہنگائی۔ روزانہ کالونی سے بینک تک آٹھ میل کا فاصلہ بذریعہ بس طے کرنا پڑتا۔ بہت جلد یہ جان لیوا احساس ہونے لگا کہ "علم کے قد بالا پر قبائے معاش تنگ ہی نہیں۔ چنگیوں سے تنگ جگہ سے مسکنے لگی (ہے)"۔

ملازمت کے لیے ڈیڑھ گھنٹہ بیچ پر بٹھانے کے بعد اینڈرسن نے انٹرویو کے لیے بلایا اور بہت دیر تک اوٹ پٹانگ باتیں کرتا رہا۔ یوسفی نے اسے مطلع کیا کہ ان کا تقرر اورینٹ ایئرویز میں ہوا تھا لیکن حال ہی میں ایک ہوائی جہاز گر گیا جس کی وجہ سے اب وہ پس و پیش میں مبتلا ہیں۔

"ہاہا! عالی دماغ لوگ ایک ہی طرح سوچتے ہیں۔ شاہی سواری صرف ایک ہے، اسٹیمر، بہر صورت ہوائی حادثے کی بہ نسبت بحری جہاز کی تباہی میں تحفظ کا کہیں زیادہ امکان ہے!"

اور پھر کچھ مشورے بھی۔ "لارڈ چسٹر فیلڈ کے خطوط پڑھا کرو جو اس نے اپنے نیچرل سن (Natural Son) کو لکھے تھے۔ جانتے ہو، انگریزی میں حرامی اولاد کو فطری بیٹا کہتے ہیں؟ اس لحاظ سے ہم تم غیر فطری اولاد ہوئے، ہاہا!"۔

کسی طرح پنڈ چھڑا کر نکلنے والے تھے کہ جست لگا کے ہمت کہہ کر پھر واپس بلا لیا۔ بڑی بے بسی سے سوچا۔ "رب العزت! اب کون سی کسر باقی رہ گئی۔ یہ ابابیلوں کا ٹکسیا جسے پاپی پیٹ کہتے ہیں، یہ تو کبھی کا بھر چکا!"

لیکن اب اینڈرسن کی نگاہوں میں ان کا تھری پیس سوٹ کھٹک رہا تھا۔

"ایمان کی بات ہے، اس سے زیادہ 'well-dressed scare-crow' میں نے اپنی زندگی میں نہیں دیکھا۔ (مگر) یہ شطرنج کی بساط جیسا چوخانے دار سوٹ اور میرے دیس کی نارتھ تانی پہن کر بینک نہ آنا۔ بینکروں اور کمپنیوں کا روایتی پہناوا سیاہ سوٹ پہنا کرو، ٹریڈ مارک!"

پچیس سال گزرنے کے بعد یوسفی معترف ہیں، "۱۹۷۴ء میں میرے یونائٹڈ بینک لمیٹڈ کا پریذیڈنٹ ہونے کی واحد وجہ یہ ہے کہ جس انگریز جنرل منیجر نے ۱۹۵۰ء میں انٹرویو کر کے مجھے بینک میں ملازم رکھا وہ اس وقت نشے میں دھت تھا۔ اس واقعے سے سبق ملتا ہے کہ شراب نوشی کے نتائج کتنے دور رس ہوتے ہیں!"

ویسے بینک کی ملازمت کے ابتدائی دنوں میں بڑی مشقت کرنی پڑی۔ ایک دن شام کے چھ بج رہے تھے، جب بھوک کے مارے برا حال ہوا تو سڑک سے بھٹا منگوا کر کھانے لگے اتنے میں اینڈرسن آ دھمکا۔ دونوں ہاتھ چھوڑ کر "اٹینشن" ہو گئے مگر بھٹے کو دانتوں سے پکڑے رکھا۔ لال بھبوکا ہو کر کہا "ہیلو، نیرو، بیٹے (بھٹے) سے بانسری کیوں بجا رہے ہو؟ اپنی کٹلری ڈس انفکٹ کر کے مجھ سے میرے چیمبر میں ملو!"۔

پیش خدمت ہوئے تو پوچھا "یہ بھٹے جس کے سرے تمھارے دونوں کانوں سے باہر نکلے ہوئے تھے، بتاؤ یہ کہاں پیدا ہوتی ہے؟" جواباً عرض کیا کہ اسی ملک میں۔

"شاباش، تمھاری اطلاع کے لیے صوبہ سرحد میں بہترین مکئی پیدا ہوتی ہے۔ جینٹلمین بھی، بتاؤ، جینٹلمین سے کیا چیز بنتی ہے؟"

"شکر!" دوبارہ شاباشی دیتے ہوئے فرمایا۔

"تم ان لوگوں سے زیادہ قابل ہو، جو تم سے کم قابل ہیں!"

اینڈرسن کی خشونت اور سرزنش میں بھی ایک ادائے دلنوازی و دلداری تھی۔ اکثر کہتا۔

"پاکستانی سور میں چربی کم مگر سور پن زیادہ ہوتا ہے۔ اسی لیے ہم یورپین اسے بڑے شوق سے کھاتے ہیں"۔

قلیل تنخواہ اور کنبے کے لواحقین کے ساتھ جیسے تیسے بسر کرتے رہے۔ اللہ کی کرنی، ایک دن گھڑی چوری ہو گئی۔ لوگوں نے بہت منع کیا کہ "غیر رقمی چوری کی رپٹ تھانے میں نہ لکھواؤ، شرفا کے لیے یہ بڑی بے عزتی کی بات ہے کہ گھر میں چور آئیں اور چرانے کے لیے کوئی رقم ہی نہ نکلے"۔ بہر کیف، نہیں مانے اور انجام کار بڑی خفت و شرمندگی اٹھانا پڑی۔

اینڈرسن ان کی انگریزی دانی سے بہت متاثر تھا لیکن اس کے مطابق یوسفی کی انگریزی گرامر کی گتھیوں میں الجھی تھی اور دفتری دھوپ چھاؤں میں ابھی اس کے جوڑ بند نہیں کھلے تھے۔ شومئی قسمت، ایک دن انھوں نے اینڈرسن کے ڈرافٹ میں نیسفیلڈ گرامر کی رو سے کسی معمولی سے سقم کی نشان دہی کر دی۔ پہلے تو بہت بھڑکا، پھر ٹھنک کر بولا "افسوس، تم نے کسی اہل زبان سے انگریزی نہیں پڑھی!"

جواباً عرض کیا... "ہم نے ایک انگریز عورت سے انگریزی پڑھی تھی (۱۹۴۳-۴۴ء میں)، مس مارجری بانفرو دو سیر کے لیے ہندستان آئی تھی۔ اثنائے سیر میں دوسری عالمی جنگ چھڑ گئی۔ (چنانچہ) وقت گزاری کے لیے سینٹ جانس کالج آگرہ میں پوئٹری کی کلاس لینے لگی!"

"بہرحال، تم میرے پہلے پاکستانی ماتحت ہو جو سیمی کولن استعمال کرنے کا جگرا رکھتا ہے۔ تم انگریزی خاصی لکھ لیتے ہو (لیکن) اگر شگفتگی سے پرہیز کرو تو کہیں بہتر لکھ سکتے ہو!"

پھر یوسفی ان دنوں کا ذکر کرنے لگے جب وہ سینٹ جانس کالج آگرہ کے نیلی بری ہوسٹل کے تنگ و تاریک کمرہ نمبر ۲۳ میں مقیم تھے۔ بعد ازاں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں تعلیم مکمل کی۔

بندو خاں قمر کورٹ کے سرونٹس کوارٹر میں رہتا اور وہیں اینڈرسن کی رہائش تھی۔ ایک دن اس نے یوسفی سے شکایت کی "اب وہ حرامی پلا (اینڈرسن کا کتا ٹونی) بھی دارو پینے لگ گیا ہے!"

پوچھا... "تم نے اپنی آنکھ سے ٹونی کو شراب پیتے دیکھا؟"

بولا... "نہیں، مسلمانوں کی طرح چھپ کے پیوے ہے!"

بینک کے ملازم سیف الملوک خاں کے قدرے تفصیلی ذکر کے بغیر یوسفی کی شخصیت کے نقوش دھندلے رہیں گے۔ ایک دن اینڈرسن نے ان کی کوشواری کے بعد کہا "قر نیٹر میں نہایت عمدہ قسم کا ورجینیا تمباکو پیدا ہوتا ہے۔ اس کی کاشت، پیداوار، تجارت اور قرضوں سے متعلق تمھاری معلومات صفر ہیں۔ خان اسی نواح کا رہنے والا قبائلی ہے۔ تمھاری طرح فکر فردا اور حساب کتاب سے ماورا ہے۔ آئندہ چار ہفتے اس کی ڈیسک پر ٹریننگ لو اور اپنی ناقص معلومات کا خلاصہ اگلے مہینے پیش کرو!" اور اس طرح وہ خان کی تحویل میں دے دیے گئے۔

خان صاحب کو شکار کا شوق جنون کی حد تک تھا اور ان کی واحد کائنات ایک بندوق تھی جسے وہ پیار سے ابدالی کہتے۔ خان سب جانوروں اور پرندوں کو پشتو میں گالی دیتے لیکن کبوتر سے اردو میں خطاب فرماتے۔ کہتے تھے کبوتر سید ہوتا ہے!

خان سے بہت جلد گاڑھی چھننے لگی۔ دونوں ہر اتوار کو مکھنو پیر کی پہاڑیوں میں شکار کھیلنے جاتے اور تمباکو کے علاوہ بھی زندگی کے دوسرے موضوعات پر دل چسپ گفتگو ہوتی۔

خان نے کہا... "شیر کے شکار میں دو تین سو آدمی چاروں طرف سے ہانکا کریں تو سب سے پہلے سور نکلتے ہیں!"

یوسف بولے... "سیاست میں بھی یہی ہوتا ہے!"

"آپ کو کبھی کوئی عورت اچھی لگی؟" ایک دن یوسفی نے معصومیت سے پوچھا۔

"میں نے تو کوئی جوان عورت بدصورت نہیں دیکھی۔ مگر آپ بھی اپنے پتے دکھائیے۔ شادی والدین نے طے کی یا اپنی پسند سے کی؟"

"میں نے اپنی بیوی کی پسند کی شادی کی۔ (مسوری میں)" یوسفی نے جواب دیا۔

"شادی کے بعد کوئی شکار شکور ہوا یا مچان پہ ٹنگے ٹنگے ہانکا تماشا دیکھتے رہے، کوئی افیئر؟"

"مفلسی وجہ پارسائی ہے، بحمداللہ ہم بہت قانع اور متقی ہیں!"

"یہ متقی کیا بلا ہوتی ہے جی، یہ اصطلاح تم نے کس سے سیکھا؟"

"جمعہ کے خطبے میں مولوی خیر الدین نے اس کے فضائل بیان کیے تھے!"

"اور کیا کیا فضائل بیان کیے تھے اس متقی نے؟"

"کہا تھا کہ جو مومن اپنی نظریں نیچی رکھے گا اور پاک دامن رہے گا، اس کو بہشت میں اپنی ہی بیوی حور کی شکل میں ملے گی!"

"تو، پھر مرنے سے فائدہ ہی کیا ہوا!"

ایک دن یوسفی کا جی بہت اداس تھا اور انھوں نے خان سے دل کی بات کہہ دی۔

"جو کچھ پڑھا لکھا وہ دھرے کچھ کام نہ آیا، تین دن ہوئے بچی سخت بیمار تھی۔ اس کے لیے انجکشنوں کی ضرورت پڑی، ہم نے یونیورسٹی میں اول آنے کا گولڈ میڈل پشاور (صراف) میں بکوا دیا۔ ڈھائی تولے کا طلائی تمغہ ۲۳ روپیہ میں بکا، آگرہ یونیورسٹی نے چاندی پر سونے کا پتر چڑھوا دیا تھا"۔

خان صاحب چونک پڑے... "اچھا! ہم پر بھی ذرا بے خبری وقت آن پڑا ہے۔ یہ انگوٹھی بچی ہے، صراف کا کیا ہے؟ اعتباری آدمی ہے؟"

دوسرے دن خان صاحب لنچ کے وقفے کے بعد خاموشی سے آئے اور ایک لفافہ انھیں تھما دیا۔ اس میں ان کا گولڈ میڈل تھا، خان کی انگلی میں انگوٹھی نہیں تھی!

کچھ عرصہ بعد یوسفی سے کہا... "ایک درخواست انگریزی میں اس مضمون کی لکھ دیجیے کہ مجھے فوراً ترقی دے کر مردان کا منیجر بنا دیا جائے!"

"مگر مردان میں تو بینک کی کوئی شاخ نہیں ہے!"

بولے... "مجھے ترقی دینی ہے... تو پدر سوختہ کو شاخ بھی کھولنی پڑے گی!"

یوسفی کو بڑی حیرت ہوئی جب انھوں نے دیکھا کہ چھ ہفتے کے اندر مردان میں بینک کی شاخ کھل گئی اور خاں صاحب سچ مچ اس کے منیجر مقرر ہو گئے۔

یہ بات ۱۹۵۱-۵۲ء کی ہوگی۔ اس کے بعد اٹھارہ انیس سال بیت گئے اور یوسفی اس دوران ترقی کی منزلیں طے کرتے ہوئے یونائٹڈ بینک کے اعلا عہدوں پر فائز ہوئے۔ ۱۹۷۰ء میں بینک کی زیر تعمیر عمارت کے سلسلے میں انھیں نوشہرہ جانے کا اتفاق ہوا جو مردان سے آٹھ میل کے فاصلے پر ہے۔ نئی عمارت کے سلسلے میں بہت سے متنازعہ فیہ مسائل درپیش تھے اور یوسفی دھوپ میں نقشہ پھیلائے ٹھیکیدار سے بار بار الجھ رہے تھے۔ بحث و تکرار کا سلسلہ جاری تھا کہ دیکھا۔

"ایک تانگہ آکر رکا اور اس سے خان صاحب برآمد ہوئے۔ (انھوں نے) پہلے ٹھیکیدار سے اس کا اور اس کے باپ کا نام پوچھا اور پھر اس کا نام مع ولدیت لے لے کر گالیاں دینی شروع کر دیں۔ انھیں اس سے غرض نہیں تھی کہ قضیہ کیا ہے اور کون حق پر ہے، وہ دوست کے ساتھ تھے!"

غصے کی لالی چہرے سے رخصت ہوئی تو انھیں بہ غور دیکھ کر یوسفی کا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ "منہ کی ہڈیاں باہر نکل گئی تھیں، ہاتھ اور انگلیاں جیسے بوڑھے درخت کی جڑیں، ایک آنکھ پر سبز رنگ کا میلا سا کپڑا، شانے خمیدہ، چہرہ گرد ملال سے اٹا ہوا"۔

یوسفی نے کہا... "آپ نے بڑی زحمت کی، میں کار بھیج کر بلوا لیتا!"

چند رسمی باتوں کے بعد خان نے کہا... "کوئی شعر سنائیے، جی بہت اداس ہے!"

جواب دیا... "وہ باتیں، وہ

(بقیہ صفحہ ۷ پر)

اردو دُنیا

راشٹر سنت تکڑوجی مہاراج یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں

اساتذہ کا تقرر کیا جائے

ناگ پور (پریس ریلیز)۔ اہل اردو کے لیے یہ خبر باعث مسرت ہے کہ حکومت مہاراشٹر نے راشٹر سنت تکڑوجی مہاراج ناگپور یونیورسٹی میں شعبۂ اردو کے قیام کی منظوری دے دی ہے۔ کثیر تعداد میں طلبہ وطالبات نے ایم اے اردو میں داخلہ بھی لیا اور پہلے سال کے امتحان میں شریک بھی ہوئے۔ یکم مارچ ۲۰۱۳ء کو شعبۂ اردو کا افتتاح وزیر برائے اقلیتی امور و اوقاف جناب عارف نسیم خان نے فرمایا۔ اس موقع پر انھوں نے شعبۂ اردو میں اساتذہ کی تقرری کرنے اور کلاس کے لیے معقول جگہ کے انتظام کا اعلان بھی کیا۔

مہاراشٹر میں کانگریس پارٹی برسر اقتدار ہے اور جناب عارف نسیم خان حکومت مہاراشٹر میں باا ثر اور ذمہ دار شخصیت کے مالک ہیں۔ ہم عہدیداران و اراکین انجمن ترقی اردو (ہند) شاخ ناگپور جناب عارف نسیم خاں کی توجہ اردو کے اس مسئلے پر مبذول کرانا چاہتے ہیں اور اپیل کرتے ہیں کہ ناگپور یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں اساتذہ کا تقرر اور شعبے کے لیے معقول جگہ کا انتظام حکومت مہاراشٹر کی جانب سے کرایا جائے۔

ڈاکٹر اظہر حیات

سکریٹری انجمن ترقی اردو (ہند) شاخ ناگپور

خصوصی اردو ٹی ای ٹی کے پہلے پرچے میں

20 سے زائد غلطیوں کا انکشاف

27 ہزار اردو اساتذہ کی بحالی کا نشانہ اب بھی پورا نہیں ہوسکا ہے

پٹنہ (۱۴ رجولائی)۔ بہار کے اسکولوں میں اساتذہ کی کمی کے پیش نظر ریاستی حکومت نے جس منشا سے بحالی کا عمل شروع کیا تھا وہ اب بھی جاری ہے مگر سرکاری عملوں کی سست روی اور عدم دلچسپی کے باعث یہ ہدف اب تک حاصل نہیں کیا جاسکا ہے۔ اردو اساتذہ کی بحالی کے معاملے میں تو اور بھی برا حال ہے۔ 27 ہزار اردو اساتذہ کی بحالی کا نشانہ اب بھی پورا نہیں ہوسکا ہے اور اس کی تقرری میں اتنی پیچیدگیاں ہیں کہ حکومت نے بھی اب ہتھیار ڈال دیا ہے۔ ریاستی حکومت نے پرائمری اور مڈل اسکولوں میں اردو کی تعلیم کے لیے 27 ہزار اساتذہ کی تقرری کا فیصلہ کیا تھا اور اکتوبر ۲۰۱۳ء میں اس کے لیے خصوصی امتحان کا انعقاد کیا گیا تھا لیکن بدقسمتی سے اس امتحان کے پہلے پرچے (ایک سے پانچ تک) اور دوسرے پرچے (چھ سے آٹھ تک) میں غلط سوالات وغلط جوابات کے نتیجے میں 27 ہزار اردو امیدواروں کی جگہ صرف 15310 امیدوار کامیاب ہوسکے۔ تقریباً 12 ہزار اردو سیٹیں اب بھی خالی ہیں جس پر اردو اساتذہ کی بحالی ہوسکتی ہے۔ خیال رہے کہ کاروان اردو بہار نے اردو ٹی ای ٹی کے اس نتیجے کے خلاف سڑکوں پر اتر کر احتجاج کیا۔ ایوان میں بھی اس موضوع پر جم کر ہنگامہ آرائی ہوئی۔ کاروان اردو کے کنوینر اور سابق حزب اختلاف کے لیڈر پروفیسر غلام غوث نے اس کے لیے ایک لمبی لڑائی لڑی جس کے نتیجے میں پرچہ دوم (۶ سے ۸ تک) میں 10 نمبر کا گریس دیا گیا۔ ذرائع کے مطابق اس گریس سے تقریباً 1600 امیدواروں کو فائدہ ہوا۔ اس کے بعد یہ سوال بھی اٹھا کہ جب دوسرے پرچے میں غلط سوالات وغلط جوابات کی بنا پر 10 نمبر کا گریس مل سکتا ہے تو اسی بنیاد پر پہلے پرچے (ایک سے پانچ تک) میں گریس کیوں نہیں دیا جاسکتا۔ کاروان اردو نے خصوصی اردو ٹی ای ٹی کا پرچہ اوّل دکھاتے ہوئے کہا کہ اس پرچے میں بھی 20 سے زائد سوالات وجوابات غلط ہیں۔ انھوں نے دعویٰ کیا ہے کہ اطفال ترقی اور تعلیم کے پرچے میں سوال نمبر 1، 2، 10، 13، 16، 20، 21، حساب کے سوال نمبر 58، ماحولیات کے پرچے میں سوال نمبر 70، 79 اور اردو کے پرچے میں سوال نمبر 104، 105، 113، 115، 118، 119، 128، 148 میں خامیاں ہیں۔ اگر انھیں درست کیا جائے اور اس بنیاد پر کاپیوں کی جانچ کرائی جائے تو کئی ہزار امیدواروں کو اس کا فائدہ حاصل ہوسکتا ہے۔ انھوں نے مطالبہ کیا ہے کہ کم از کم انھیں بھی 15 نمبر کا گریس دیا جانا چاہیے، ایسا نہ کرنا اردو امیدواروں کے ساتھ ناانصافی ہوگی۔ انھوں نے اس ضمن میں آج وزیر اعلیٰ نتیش کمار سے بھی ملاقات کی۔ وزیر اعلیٰ نے انھیں گریس دینے کی یقین دہانی کرائی ہے۔

(انقلاب۔ دہلی)

نہرو گرام بھارتی یونیورسٹی میں

اردو سے ایم اے کی تعلیم کا آغاز

الٰہ آباد (۱۳ رجولائی)۔ نہرو گرام بھارتی یونیورسٹی الٰہ آباد میں اردو سے ایم اے کی تعلیم حاصل کرنے کا آغاز امسال ہوگیا ہے۔ اب تک یہاں صرف بی اے سطح پر ہی اردو کی تعلیم دیے جانے کا انتظام تھا جب کہ دیگر اور مضامین میں ایم اے کی تعلیم پہلے سے ہی دی جارہی ہے۔ یہ اطلاع شعبۂ اردو کے استاد ڈاکٹر حسین جیلانی نے دی۔ انھوں نے بتایا کہ یونیورسٹی کی میٹنگوں میں اکثر وہ اس بات پر اصرار کرتے تھے کہ الٰہ آباد یونیورسٹی کے علاوہ آس پاس اردو سے ایم اے کی ریگولر تعلیم کا انتظام نہ ہونے کے سبب بہت سارے طالب علم یا تو اردو سے ایم اے کرنے سے محروم ہوجاتے ہیں یا کسی اور سبجیکٹ سے ایم اے کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں یونیورسٹی کے بانی اور چانسلر بے این مشرا نے ذاتی طور پر دل چسپی لیتے ہوئے اردو سے ایم اے کی تعلیم دیے جانے کا انتظام کرایا۔ یونیورسٹی کے اس قدم سے طالب علموں کو اردو سے ریگولر ایم اے کرنے کی سہولت دستیاب ہونے کے ساتھ ہی جلد ہی اردو سے ریسرچ کا سلسلہ بھی شروع ہوجائے گا۔

(راشٹریہ سہارا۔ دہلی)

اردو بولے بلبل، ہندی بولے کوئل

اردو کو سرکاری زبان کا درجہ دینا غیر آئینی نہیں: چیف جسٹس

نئی دہلی (۵ راگست)۔ اردو بولے بلبل، ہندی بولے کوئل' اترپردیش میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دیے کے خلاف دائر پٹیشن پر بحث کے دوران سپریم کورٹ کے چیف جسٹس راجندر مل لودھا نے یہ تبصرہ کیا۔ چیف جسٹس کی قیادت والی آئینی بنچ نے سرکاری زبان کے بارے میں آئینی بنچ میں ہوئی بحث کے دوران دونوں زبانوں کی اہمیت اور ضرورت کی بات کہی۔

آئینی بنچ نے کہا کہ لسانی اقلیت کے لیے ایک زبان کو سرکاری زبان کا درجہ دینے کا ریاستی سرکار کو اختیار حاصل ہے، اس لیے اردو کو اترپردیش کی دوسری سرکاری زبان کا درجہ دینے کے اترپردیش سرکار کے حکم کو غیر آئینی نہیں کہا جاسکتا۔ چیف جسٹس راجندر مل لودھا، جسٹس دیپک مشرا، مدن لوکر، شرد اروند بوبڑے اور کورین جوزف کی آئینی بنچ کے سامنے اترپردیش ہندی ساہتیہ سمیلن کی جانب سے سینئر وکیل شیام دیوان نے دلیل دی کہ ہندی کو سرکاری زبان کا درجہ دیے جانے کے بعد کسی دوسری زبان کو سرکاری زبان کا درجہ دیا جانا غیر آئینی ہے۔ انھوں نے کہا کہ ریاستی سرکار نے متحد بھارتی کی پالیسی کے تحت اردو کو سرکاری زبان کا درجہ دیا ہے جب کہ آئین کے آرٹیکل 345 کے تحت حکومت سرکاری زبان طے کرنے کا اختیار صرف ایک بار استعمال کرسکتی ہے۔ جب ہندی سرکاری زبان ہے تو کسی اور زبان کو اس کے برابر کھڑا نہیں کیا جاسکتا اور صرف صدر جمہوریہ کو ہی دوسری سرکاری زبان بنانے کا اختیار ہے۔ اس کے باوجود اترپردیش اسمبلی نے اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دے دیا، جس کی وجہ سے اردو کو ۱۹۸۹ء سے سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہے۔ شیام دیوان نے کہا کہ انتظامی سہولت اور لوگوں کی ضرورت کے پیش نظر اگر اردو کا استعمال کیا جاتا ہے تو اس پر کسی کو کوئی اعتراض نہیں ہے۔ کلچر کی حیثیت سے بھی اگر اردو کو فروغ دیا جاتا ہے تو بھی اعتراض نہیں کیا جاسکتا لیکن سرکاری زبان کا درجہ دینے کا ریاستی سرکار کو اختیار نہیں ہے۔ انھوں نے ہندی اور اردو کے معاملے میں آئین ساز اسمبلی میں ہوئی تفصیلی بحث کا ذکر کیا، جس میں جواہر لال نہرو اور مہاتما گاندھی ملی جلی زبان ہندوستانی کے حق میں تھے۔ آئین ساز اسمبلی کے دل چسپ واقعات کا ذکر آنے پر چیف جسٹس نے دونوں زبانوں کو ایک جملے میں پرو دیا اور کہا کہ اردو بلبل ہے تو ہندی کوئل۔ ان کا مقصد تھا کہ دونوں زبانوں کی اپنی اہمیت ہے۔ آئینی بنچ نے کہا کہ یہ کہنا غلط ہے کہ سرکاری زبان کا درجہ دینے کا فیصلہ صرف ایک بار اور ایک زبان کے لیے کیا جاسکتا ہے۔ آرٹیکل 345 کا استعمال ایک بار نہیں کئی بار کیا جاسکتا ہے۔ کسی خاص مقصد کے لیے سرکار اپنے آئینی حق کا استعمال کرسکتی ہے۔ واضح ہو کہ اترپردیش ہندی ساہتیہ سمیلن نے الٰہ آباد ہائی کورٹ کے فیصلے کے خلاف ۱۹۹۷ء میں سپریم کورٹ میں اپیل دائر کی تھی۔

(راشٹریہ سہارا۔ دہلی)

عادل آباد میں اساتذہ کی کمی سے مشکلات

کئی اردو مدارس کے بند ہوجانے کا خدشہ

خانہ پور، تلنگانہ (۷ راجون)۔ ضلع عادل آباد میں تعلیمی سرگرمیوں کا آغاز ہوچکا ہے لیکن اساتذہ کی کمی کے سبب طلبہ اوران کے سرپرست سخت پریشان ہیں اور کئی اردو مدارس کے بند ہوجانے کا خدشہ پیدا ہوگیا ہے۔ اساتذہ کی اس کمی کے پیش نظر ڈی ای او عادل آباد نے گزشتہ سال کنٹریکٹ کی بنیاد پر 120 اکیڈمک انسٹرکٹرس کا تقرر کیا تھا۔ مدارس کی تعطیلات کے بعد اکیڈمک انسٹرکٹرس (ودیا والینٹیرس) کی میعاد بھی ختم ہوچکی۔ اب جب کہ مدارس میں دوبارہ تعلیم کا آغاز ہوچکا ہے، اساتذہ کی کمی کو پورا کرنے کے لیے اکیڈمک انسٹرکٹرس کے تقرر کے احکام نہیں دیے گئے جس کے باعث صورت حال انتہائی ابتر ہوچکی ہے۔ موجودہ صورت حال یہ ہے کہ اساتذہ کے نہ ہونے سے کئی مدارس میں طلبہ کو داخل کرنے کے لیے سرپرست آگے نہیں آرہے ہیں اور مجبوراً اپنے بچوں کو خانگی مدارس میں شریک کروا رہے ہیں۔ خانہ پور کے ایسے کئی اردو مدارس جہاں پہلے طلبہ ہیں، اساتذہ کے نہ ہونے سے فکرمند ہیں۔ طلبہ کے سرپرستوں نے اس جانب توجہ دیتے ہوئے فی الفور اردو میڈیم مدارس میں اکیڈمک انسٹرکٹرس کے تقرر عمل میں لانے ضلع کلکٹر اور ڈی ای او عادل آباد سے مطالبہ کیا ہے تاکہ ان اردو مدارس کو بند ہونے سے روکا جاسکے۔

(اعتماد۔ حیدرآباد)

اردو دلوں کو جوڑنے والی زبان ہے

یوپی کے وزیر اعلا اکھلیش یادو نے اترپردیش اردو اکادمی کے انعامات تقسیم کیے

لکھنؤ (۳ راگست)۔ وزیر اعلا اکھلیش یادو نے اپنی سرکاری رہائش گاہ پر منعقد تقریب میں سال ۲۰۱۱، ۲۰۱۲، اور ۲۰۱۳ء کی کتابوں پر اترپردیش اردو اکادمی کے ذریعے اعلان کیے گئے انعامات اردو کے قلم کاروں، ادیبوں اور شاعروں کو تقسیم کیے۔ دو گھنٹے سے زائد تاخیر سے شروع ہونے والی تقریب میں تقریباً 245 افراد کو انعامات تقسیم کیے گئے جو اترپردیش کے علاوہ باہر کی ریاستوں سے بھی آئے تھے۔ اس موقعے پر وزیر اعلا نے کہا کہ اردو نے ہمیشہ دلوں کو جوڑا ہے۔ جب اردو بولی جاتی ہے تو پیار چھلکتا ہے اور محبت دکھائی دیتی ہے۔ یہ ایسی زبان ہے جو دلوں میں بس جاتی ہے اس لیے، اردو کو دلوں کو جوڑنے والی زبان کہا جاتا ہے۔ وزیر اعلا نے ہر ادیب کو توصیفی سند، علامتی نشان اور انعامی رقم کا چیک پیش کیا۔ مسٹر یادو نے کہا کہ ہندی اور اردو مل کر سماج کو آگے بڑھانے کا کام انجام دے رہی ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ریاستی حکومت کی منشا ہے کہ دونوں زبانیں مزید ترقی کریں اور انگریزی کا مقابلہ کریں۔ فی الوقت جو حیثیت اور احترام انگریزی زبان کو حاصل ہے وہ ان زبانوں کو بھی ملے، اس کے لیے ہم سبھی کو مل کر کوشش کرنی ہوگی۔ ہندستانی زبانوں کو فروغ دینے کے تئیں سماج وادی حکومت کے نظریے کا ذکر کرتے ہوئے وزیر اعلا نے کہا کہ نیتا جی جب وزیر اعلا تھے تو اردو کی حوصلہ افزائی کی گئی تھی۔ موجودہ حکومت نے سنسکرت، ہندی اور اردو کے ادیبوں کو اعزاز دینے کا کام دوبارہ شروع کیا۔ سابقہ حکومت کے دور اقتدار میں ادیبوں کو اعزاز دینے اور ان کی تخلیقات کو انعامات دینے کا کام نہیں ہوا۔ انھوں نے کہا کہ اردو اکادمی کے مطالبات اور ضروریات کی تکمیل کے لیے ریاستی حکومت ہر ممکن مدد مہیا کرائے گی۔

اس سے قبل اکادمی کے چیئرمین ڈاکٹر نواز دیوبندی نے اکیڈمی کی مختلف سرگرمیوں کی معلومات فراہم کرائیں۔ آئندہ اسکیموں کی تفصیل کی اطلاع دیتے ہوئے انھوں نے بتایا کہ اکادمی کے ذریعے اردو لٹریچر لیب اور ای پبلشنگ پروجیکٹ پر کام کیا جا رہا ہے۔ بچوں کے لیے ایک میگزین کی اشاعت شروع کرنے کا بھی منصوبہ ہے۔ اکادمی کی مرکزی لائبریری میں کتابوں کے ڈیجیٹلائزیشن کا کام جاری ہے۔ اکادمی نے آئی اے ایس اور پی سی ایس امتحانات کے امیدواروں کی کوچنگ کے لیے ایک کوچنگ سنٹر چلانے کی اسکیم بھی تیار کی ہے۔ چیئرمین نے بتایا کہ ۲۰۱۴ء کے انعامات کے لیے ہمیشہ کی طرح ۱۵ر جنوری ۲۰۱۵ء آخری تاریخ ہے۔ نواز دیوبندی نے کہا کہ حکومت اترپردیش نے اس سال اردو اکادمی کی اسکیموں کے لیے دو کروڑ 33 لاکھ روپے منظور کیے ہیں، وزیر اعلا سے درخواست ہے کہ اترپردیش جیسی ریاست کے لیے یہ امداد بہت قلیل ہے، حیدرآباد، دہلی وغیرہ چھوٹے صوبوں میں ان کی اردو اکادمیوں کی گرانٹ ہم سے کہیں زیادہ ہے، گرانٹ کم ہونے کی وجہ سے ہم اپنے مصنفوں، شاعروں کی دل کھول کر مدد نہیں کر پاتے، یہ گرانٹ بڑھا کر کم سے کم دس کروڑ روپے سالانہ کر دی جائے۔ جلسے کے اختتام پر سکریٹری اترپردیش اردو اکادمی ڈاکٹر نسیم احمد نے حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔ نظامت کے فرائض اردو اکادمی کی مجلس منتظمہ کے رکن سید محمد ہاشم نے انجام دیے۔ اس موقعے پر وزیر سیاسی پنشن راجندر چودھری، وزیر ثانوی تعلیم محبوب علی، اترپردیش ہندی سنستھان کے کارگزار صدر اودے پرتاپ سنگھ، پروفیسر ملک زادہ منظور احمد، پروفیسر شارب ردولوی، بیگم حامدہ حبیب اللہ، انور جلال پوری، پروفیسر شمیم احمد ندوی، ریٹائرڈ آئی اے ایس ڈاکٹر انیس انصاری، سابق ڈی جی پی رضوان احمد، نوشابہ سردار، یوپی اقلیتی کمیشن کے چیئرمین شکیل احمد، اطہر نبی، حسین فیاض، ڈاکٹر اسلم جمشید پوری، افضل امام اور قمر گونڈوی وغیرہ موجود تھے۔

(انقلاب۔ دہلی)

خواجہ معین الدین چشتی یونیورسٹی میں اردو نظر انداز

مرادآباد (۵ راگست)۔ صوبے کی راجدھانی لکھنؤ میں واقع خواجہ معین الدین چشتی اردو عربی فارسی یونیورسٹی پر اردو زبان اور اس کی تہذیب کو ختم کرنے کا الزام لگاتے ہوئے اس یونیورسٹی کے وجود کو بچائے جانے کا مطالبہ کیا گیا ہے۔ مرادآباد ضلع کے قصبہ بھوجپور سے تعلق رکھنے والے آر ٹی آئی ایکسپرٹ سلیم بیگ نے ریاستی گورنر کو ارسال عرض داشت میں مذکورہ یونیورسٹی کی حالت زار پر اظہار تشویش کرتے ہوئے کہا ہے کہ یونیورسٹی کے ذمے داران نے اردو عربی فارسی کے ادارے میں اردو کی بقا اور تحفظ کا مسئلہ پیدا کر دیا ہے۔ مکتوب میں کہا گیا ہے کہ سال ۲۰۰۹ء میں یوپی حکومت کے ذریعے مذکورہ یونیورسٹی کا قیام عمل میں لایا گیا اور یہ اعلان کیا گیا کہ یونیورسٹی اردو عربی فارسی زبانوں کی تہذیب و بقا کے لیے کام کرے گی، ساتھ ہی انہیں اقلیتی اداروں کو مالی تعاون فراہم کرنے کی بات کہی گئی، لیکن سرکار نے ابھی تک اس کے لیے نوٹیفکیشن تک جاری کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی ہے۔ انھوں نے مکتوب میں آگے کہا کہ افسوس کا مقام ہے کہ ۲۷ اگست کو ایک ہندی روزنامے میں ایک خبر شائع ہوئی جس سے معلوم ہوا کہ مذکورہ یونیورسٹی میں اب اردو پڑھنا بھی ضروری نہیں ہے۔ اب یہاں اردو بس ایک ایلمنٹری پیپر کی شکل میں ہے، جسے بس پاس کرنا ہے، لیکن اس کے نمبر نہیں جوڑے جائیں گے۔ اس کے علاوہ اس بار سے یونیورسٹی میں ہندی میں پرچہ دینے کا بھی بندوبست کر دیا گیا ہے، اس سے قبل صرف اردو اور انگلش میں ہی پرچہ دیا جا سکتا تھا۔ عرض داشت میں الزام لگایا گیا ہے کہ موجودہ سرکار، یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر خان مسعود احمد اور رجسٹرار ڈاکٹر ناظم حسین کے سبب اردو داں طبقوں میں اس لیے مایوسی ہے کہ ان کے حقوق پر ڈاکہ ڈالنے کے ساتھ ساتھ ان کے ساتھ دھوکا کیا جا رہا ہے۔ ابھی تک نہیں موجودہ اکیڈمک سیشن ۱۹ر جولائی سے شروع ہو گیا ہے اور ہندی، اکنامکس اور پولیٹکل سائنس کے ٹیچرز کی تقرری نہیں کی گئی ہے، جس سے طالب علموں کی پڑھائی کا نقصان ہو رہا ہے جو ان کے مستقبل کے ساتھ کھلواڑ ہے۔

(راشٹریہ سہارا۔ دہلی)

اسکولوں میں اردو وریاضی کی کتابیں تبدیل

رام پور (۱۳ راگست)۔ بنیادی محکمہ تعلیم نے ریاضی اور اردو کی کتابوں میں تبدیلی کی ہے۔ کلاس چھ، سات اور آٹھ کی کتابوں کو ملا کر ریاضی کی ایک کتاب بنائی گئی ہے جو نئے تعلیمی سیشن سے پڑھائی جائے گی۔

بنیادی محکمہ تعلیم بچوں پر کتابوں کا مزید بوجھ نہیں ڈالنا چاہتی۔ محکمے کو تعلیم کے ساتھ نصاب کی بھی فکر ہے۔ اس بار محکمے نے دو موضوعات کی کتابوں کو تبدیل کیا ہے، جن میں ریاضی اور اردو کی کتابیں شامل ہیں۔ ریاضی کی کلاس چھ، سات اور آٹھ کی الگ الگ کتابیں تھیں انھیں ملا کر ایک ہی کتاب بنائی گئی ہے۔ اب کتاب کا نام صرف ریاضی ہوگا۔ بس کلاس کا نام اس پر ضرور لکھا ہوگا۔

اسی طرح اردو کی کتابوں کو بھی ملایا گیا ہے۔ کلاس ایک سے چار تک زبان کی کرن نام سے کتاب تھی اور کلاس پانچ میں کتاب کا نام چہک تھا۔ کلاس آٹھ میں کتاب کا نام ہماری زبان تھا۔ اب کلاس ایک سے لے کر آٹھ تک کتاب کا نام 'اردو زبان' ہے۔ یہ نصاب اسکولوں میں تقسیم کیا جا رہا ہے۔ محکمے کو زیادہ تر موضوعات کی کتابیں مل چکی ہیں۔ ضلع کوآرڈینیٹر موہن سوروپ بھٹناگر نے بتایا کہ کتابوں کی تقسیم تقریباً مکمل ہو چکی ہے۔

(انقلاب۔ دہلی)

میدک کے 100 مدارس میں ٹیچرس کے بغیر تعلیم کا آغاز

52 اردو کے اور 48 تلگو کے اسکول شامل

سنگاریڈی، تلنگانہ۔ محکمۂ تعلیمات کے ذرائع کے مطابق ٹیچرس کے بغیر ضلع کے 100 سے زائد سرکاری مدارس میں تعلیمی سرگرمیوں کا آغاز کر دیا گیا ہے جن میں 52 اردو میڈیم اور 48 تلگو میڈیم اسکولس شامل ہیں۔ ان تمام مدارس میں تعلیم کو متاثر ہونے سے بچانے کے لیے قریبی مدارس کے اساتذہ کو متعین کرنے کے اقدام کیے جا رہے ہیں۔ چند جگہوں پر ایک یا دو اساتذہ کو ایک ہی وقت میں زائد از 100 طلبہ کو پڑھانے کے لیے مجبور کیا جا رہا ہے مثال کے طور پر منڈل پریشد نیو اپر پرائمری اسکول (ایم پی این یو پی ایس) واقع جیر مٹم اور کیا گھر میں جہاں بالترتیب 210 اور 206 طلبہ ہیں ان کی تعلیم کے لیے صرف ایک ٹیچر ہے۔ عہدیدار اس بات سے اچھی طرح واقف ہیں کہ ضلع میں اساتذہ کی 935 اسامیاں خالی ہیں۔ دیہی علاقوں میں واقع اردو میڈیم مدارس میں تربیت یافتہ ودیا والینٹرس کے ذریعے تعلیم کا بندوبست ایک مشکل امر بن گیا ہے کیوں کہ وہ خود دسویں جماعت کامیاب ہیں یا اس سے بھی کم تعلیمی قابلیت رکھتے ہیں۔ ان اردو مدارس میں قابل ودیا والینٹرس کے ذریعے تعلیم کا انتظام بہت ہی مشکل ہو گیا ہے، خاص کر نارائن کھیڑ، ظہیرآباد اور اطراف و اکناف کے علاقوں میں یہ مسئلہ اور بھی سنگین ہے کیوں کہ یہاں تعلیم یافتہ ودیا والینٹرس دستیاب نہیں ہیں۔ بتایا جاتا ہے کہ گزشتہ برس اردو میڈیم مدارس میں خدمات انجام دینے والے ودیا والینٹرس کو ان کی خدمات کا مکمل معاوضہ ادا نہیں کیا گیا اس لیے، ان کی جانب سے جاریہ تعلیمی سال میں خدمات کے حصول کے لیے مناسب معاوضہ ادا کرنے پر زور دیا جا رہا ہے۔ دوسری جانب ٹیچرس کے دستیاب نہ ہونے کے سبب کئی مقامات پر اردو میڈیم طلبہ کو تلگو میڈیم کلاس میں بیٹھنے پر مجبور کیا جا رہا ہے۔ ظہیرآباد کے ایک ٹیچر نے بتایا کہ اگر ہم اردو طلبہ کو تلگو کلاس میں نہیں بٹھاتے ہیں تو انھیں اسکول سے اخراج کا خدشہ لاحق رہے گا، اس لیے، مسائل سے نمٹنے کے لیے مجبوراً ایسا کرنا پڑ رہا ہے۔

(اعتماد۔ حیدرآباد)

بہار کے اسکولوں میں اردو اور فارسی ٹیچر کی بحالی کو بھی یقینی بنائی جائے

پٹنہ (۵ راگست)۔ سابق وزیر اعلا نتیش کمار نے اعلان کیا ہے کہ بہار کے تمام سرکاری اسکولوں میں اردو اساتذہ کی تقرری لازمی طور پر کی جائے گی۔ اسکول میں اردو طلبہ کی تعداد کی لازمیت ختم کر دی گئی ہے۔ اب اسکول میں اردو کے طالب علم ہوں یا نہ ہوں اردو ٹیچر ضرور ہوں گے۔ یہ باتیں سوشل ایجوکیشن اینڈ ایجوکیشنل اینڈ ڈیولپمنٹ کے چیئرمین مولانا ابوالکلام قاسمی شمسی نے ایک پریس ریلیز میں کہی۔ انھوں نے مزید کہا کہ سابق وزیر اعلا کا مذکورہ بیان قابل ستائش ہے۔ خوشی کی بات ہے کہ اسکولوں میں اردو ٹیچروں کی بحالی کا عمل جاری ہے۔ اردو ٹیچر کی تقرری میں تیزی نہ آنے کی وجہ سے ابھی تک اس اعلان پر پورے طور سے عمل نہیں ہو سکا۔ سابق وزیر اعلا کے اعلان کو پورا کرنے کے لیے حکومت کو پوری دل چسپی کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔ فارسی/عربی کی وجہ سے اردو زبان میں چاشنی اور شیرینی آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیشہ اسکولوں میں اردو کے ساتھ فارسی اور عربی ٹیچر کی بحالی ہوتی رہی۔ بعد میں عربی اور فارسی کے عہدوں کو ختم کر دیا گیا اور دونوں زبانوں کے لیے ایک ٹیچر کی بحالی ہونے لگی، اس لیے سابق وزیر اعلا جناب نتیش کمار اور حکومت بہار سے اپیل ہے کہ اسکولوں میں فارسی ٹیچر کی بحالی کو بھی یقینی بنایا جائے تاکہ فارسی پڑھنے والے طلبہ ملازمت سے محروم نہ ہوں۔

(انقلاب۔ دہلی)

نئی کتابیں

تبصرے کے لیے دو کتابوں کا آنا ضروری ہے

نام کتاب : **گوالیار اور اردو زبان و ادب**
مصنف : ڈاکٹر قمر گوالیاری
ضخامت : ۱۱۲ صفحات
قیمت : ۱۰۰ روپے
ناشر : ڈاکٹر سلیل A-19 ، ہند متال ریزیڈنسی K. ازروڈ، بھوپال ایم پی-۲۳
تبصرہ نگار : امیر حمزہ
ameerhamzah033@gmail.com

ڈاکٹر قمر گوالیاری کا اگر تعارف کرایا جائے تو ان کے لیے یہی کافی ہے کہ موصوف نے گوالیار کی سرزمین سے ماہنامہ 'فنکار' جاری کیا جو اب 'محفل فنکار' کے نام سے جاری و ساری ہے۔ زیر تبصرہ کتاب ڈاکٹر قمر گوالیاری صاحب کی ایک تحقیقی کتاب ہے۔ اس سے پہلے موصوف کی تین کتابیں 'آنچل کیفریں'، 'اعظم' اور غزلوں کا مجموعہ 'کشش' شائع ہو کر داد و تحسین حاصل کر چکی ہیں۔

ڈاکٹر قمر کا تعلق اس خطۂ ارض سے ہے جہاں کے علم و فن نے مغل سے پہلے اور بعد کے بادشاہوں کو اپنے جانب مائل کیا۔ کئی مغل بادشاہ وہاں سیر و تفریح کے لیے جاتے اور کچھ نے اس کو اپنا نائب دارالسلطنت قرار دیا۔ اس سرزمین کا نام گوالیار ہے۔ اگرچہ گوالیار ہندو راجاؤں کا شہر رہا ہے لیکن اس سرزمین میں ہمیشہ سے اتحاد و اتفاق اور مشترکہ تہذیب غالب رہی ہے۔ صاحب کتاب کی تحقیق کے مطابق گوالیار زمانۂ قدیم سے ہی مذہبی، تہذیبی، انسانی رواداری، خلوص، علوم و فنون اور ادب کا مرکز رہا ہے۔ علوم و فنون کے اس مرکز نے زبان و ادب کی ترقی میں اہم نقوش ثبت کیے ہیں جہاں کی زبان کے متعلق فقیر اللہ سیف نے فرمایا ہے کہ "ہندوستان میں گوالیاری زبان سب سے اچھی مانی گئی ہے یہ علاقہ ہندوستان میں ایسا ہے جیسے ایران میں شیراز" اور بہ قول محمود شیرانی: "اکبر سے اورنگ زیب کے زمانے تک گوالیاری زبان کا بہت چلن تھا یہ اس وقت کے شعر و ادب اور موسیقی کی زبان تھی"۔ شاعر حضرات گوالیاری زبان کو شیریں اور خوش لسان کہتے تھے۔ عالمگیر کے زمانے میں 'تحفۃ الہند' کا ترجمہ گوالیاری زبان سے فارسی میں کیا گیا۔ اس طرح سے اور بھی بڑے بڑے اردو کے عالموں نے گوالیاری زبان کے متعلق لکھا ہے۔

زیر تبصرہ کتاب مصنف کی ایک تحقیقی کتاب ہے۔ اس کتاب سے پہلے اگرچہ گوالیار میں اردو کے آغاز و ارتقا کے متعلق بہت زیادہ کچھ نہیں لکھا گیا ہے اور نہ ہی باضابطہ کوئی کتاب اس موضوع پر ہے جسے مرجع اور مصدر کی حیثیت حاصل ہو۔ ڈاکٹر قمر گوالیاری صاحب نے پیش قدمی کی اور گوالیار میں اردو زبان و ادب کی تاریخ کو رقم کیا۔ اس کتاب کے ذریعے مصنف نے گوالیار میں بارہویں صدی عیسوی ہی سے اردو کی نشو و نما کو ثابت کیا ہے اور گوالیار کی ادبی تاریخ کو حتی الامکان پیچھے لے جانے کی کوشش کی ہے۔ مصنف نے گوالیار میں اردو زبان و ادب کی تاریخ کو حضرت شیخ محمد غوث گوالیاری سے شروع کر کے معراج دھم پوری تک لاتے ہیں۔

زیر تبصرہ کتاب میں مصنف نے سب سے پہلے گوالیار کی تاریخ کا ایک اجمالی خاکہ پیش کیا ہے۔ اس اجمالی خاکہ میں وہاں کی تہذیب کو بھی مصنف نے پیش نظر رکھا ہے جس کے ذریعے گوالیار میں اردو زبان کے آغاز و ارتقا کو بہ خوبی سمجھا جا سکتا ہے۔ مصنف نے چودہویں صدی سے ۱۸۵۷ء تک کے اہم شاعروں کو بھی پیش کیا ہے۔ اس کے بعد مصنف نے شعر و ادب کی رفتار کا عنوان قائم کیا ہے جس میں انھوں نے ۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۷ء تک کے عہد میں ادب کی رفتار کے تحت اکیس شاعروں کو پیش کیا ہے جن میں حنظر خیرآبادی، جاں نثار اختر اور فیاض گوالیاری وغیرہ شامل ہیں۔ اس کے بعد مصنف نے آزادی کے بعد کے عہد کو پیش کیا ہے جس میں انھوں نے تقریباً پچاس شاعروں کو شامل کیا ہے جس میں اس وقت کے کچھ مشہور شعرا کو بھی پیش کیا گیا ہے۔

یہ کتاب اردو کی تحقیق کے باب میں ایک اضافہ ہے جس کو مصنف نے صوری و معنوی ہر اعتبار سے خوب صورت بنانے کی بھرپور کوشش کی ہے اور بہ قول پروفیسر صادق: یہ "کتاب اپنے موضوع پر لکھی گئی ایک ایسی پہلی تصنیف ہے جو آئندہ اس موضوع پر لکھنے والوں کے لیے مفید اور اہم حوالے فراہم کرتی رہے گی۔ مجھے امید ہے کہ اردو دنیا میں اس کتاب کی خاطر خواہ پذیرائی ہوگی"۔

○○○

نام کتاب : **کشمیر کے میوہ اردو افسانے**
مرتبین : ڈاکٹر نسیم احمد، محمد مطہر امین
ضخامت : ۱۸۰ صفحات
قیمت : ۱۵۰ روپے
ناشر : ایم آر پبلی کیشنز، ۱۰ میٹرو پول مارکیٹ، ۲۵-۲۲۳۵ فرسٹ فلور، کوچہ چیلان، دریا گنج، نئی دہلی-۲
تبصرہ نگار : دیپک بدکی
deepak.budki@gmail.com

اردو ادب میں کشمیری ادیبوں کا بہت بڑا ہاتھ رہا ہے چاہے وہ نثر ہو یا نظم۔ ان میں وہ کشمیری بھی ہیں جو کئی پشتوں سے کشمیر سے باہر رہے ہیں جیسے نسیم، چکبست، سحاب، سرشار، منتو، در، حشر وغیرہ اور وہ بھی ہیں جو ریاست میں ہی پلے بڑھے اور اردو کی آبیاری کرتے رہے مثلاً پریم ناتھ پردیسی، قدرت اللہ شہاب، حامدی کاشمیری، حکیم منظور احمد وغیرہ۔ پھر وہ ادیب بھی ہیں جن کی پیدائش اور نشو و نما ریاست کے باہر ہوئی مگر ان کی زندگی کا کچھ حصہ ریاست میں گزرا جیسے کرشن چندر، جگن ناتھ آزاد اور شکیل الرحمن وغیرہ۔ جموں و کشمیر واحد ایک ریاست ہے جہاں اردو کو سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہے۔ جہاں تک افسانہ نگاری کا تعلق ہے، ریاست میں اس کی بنیاد آزادی سے پہلے پڑی اور اس بارے میں کوئی دو رائے نہیں کہ پریم ناتھ پردیسی نے کشمیر میں اردو افسانے کی بنیاد ڈالی۔ محمد مطہر امین نے کشمیری افسانوی ادب میں تین سنگ میلوں کی نشاندہی کی ہے: اول ۱۹۳۲ء جب پریم ناتھ پردیسی نے اردو افسانے کی ابتدا کی؛ دوم ۱۹۴۷ء جب شخصی راج کے خاتمے کے ساتھ ہی جمہوری راج کی بنیاد پڑ گئی لیکن ساتھ ہی بٹوارے کے باعث کئی اہم افسانہ نگار سرحد کے اس پار چلے گئے اور سوم ۱۹۸۹ء جب کشمیر کی سیاست نے ایک نئی کروٹ لی اور ریاست جنگ و جدال کی آماجگاہ بن گئی۔ ۱۹۳۲ء سے لے کر آج تک افسانہ نگاروں کا ایک کارواں جانب منزل رواں دواں رہا۔ البتہ تقسیم کی وجہ سے ان میں سے کچھ ہجرت کر کے پاکستان میں جا بسے (قدرت علی شہاب، محمود ہاشمی وغیرہ)، کچھ ریڈیو اور ٹی وی میں ڈراموں اور سیریلوں کی نذر ہو گئے (علی محمد لون، ہردے کول بھارتی وغیرہ) اور کچھ بالی ووڈ کی چمچاتی دنیا میں کھو گئے (رامانند ساگر، وید راہی وغیرہ)۔

مجموعے میں زمانی ترتیب سے تیرہ افسانے شامل کیے گئے ہیں: ۱- پریم ناتھ پردیسی کا 'دھول'، ۲- پریم ناتھ در کا 'کاغذ کا واسدیو'، ۳- اختر محی الدین کا 'پوٹھ رچھ'، ۴- علی محمد لون کا 'پاپی پجاریوں کی سنتان'، ۵- حامدی کاشمیری کا 'شملی'، ۶- پشکر ناتھ کا 'اردو کا مارا'، ۷- نور شاہ کا 'کہانی حیا کی'، ۸- عمر مجید کا 'گونگے گلاب'، ۹- ویریندر پٹواری کا 'لالہ رخ'، ۱۰- دیپک کنول کا 'لال ٹیل کا دیوانہ'، ۱۱- ترنم ریاض کی 'برف گرنے والی ہے'، ۱۲- دیپک بدکی کا 'شیر اور بکرا' اور ۱۳- غلام نبی شاہد کا 'آجادی'۔ ہر افسانہ الگ موضوع اور تاریخی پس منظر کو پیش کرتا ہے اور کشمیری نفسیات اور رویے کی عکاسی کرتا ہے۔ چوں کہ لکھنے والے سب کشمیر سے تعلق رکھتے ہیں اس لیے نہ تو ان افسانوں میں کہیں کوئی عظمت دکھائی دیتی ہے اور نہ ہی غیر فطری رومانیت۔ اس کے برعکس حقیقت پسندی ان افسانوں میں غالب ہے۔

پردیسی کے افسانے 'دھول' میں غیر کشمیری سیاحوں کا کشمیری حسن کی کم مائیگی سے فائدہ اٹھا کر اس کو تجارتی اشیا بنانا اور کیمرے سے تصویر اتار کر اس کا جذباتی استحصال کرنا انسان کی تاجرانہ ذہنیت کا آئینہ دار ہے۔ پریم ناتھ در کی شہرت یافتہ علامتی کہانی 'کاغذ کا واسدیو' میں ایک باپ اپنے بے ماں بچوں کو خوش کرنے کے لیے اور انھیں احساس کمتری سے بچانے کے لیے خود ایک مسخرا بن جاتا ہے اور برف کا کھیل کھیلتے ہوئے اپنی زندگی کھو دیتا ہے۔ اختر محی الدین کی کہانی 'پوٹھ رچھ' اپنے زمانے کی مقبول ترین کہانی رہی ہے کیوں کہ اس نام کا ایک دیوانہ سرینگر کے بازاروں میں گھومتا رہتا تھا۔ یہ یقین سے نہیں کہا جا سکتا ہے کہ کہانی واقعی حقیقت پر مبنی ہے۔ علی محمد لون کا افسانہ 'پاپی پجاریوں کی سنتان' میں انسان طاقت کی ہوڑ میں رنگ بدلتا رہتا ہے، اپنی ثقافت اور تعلیمی ورثے کو دھتکارتا ہے، صرف اپنی بھلائی کی سوچتا ہے اور اپنے سرمایے کے بل بوتے پر اکثریت کا استحصال کرتا ہے۔ افسانہ 'شملی' حامدی کاشمیری کا تحریر کیا ہوا وہ پیار کرنے والے معصوم بچوں کی کہانی ہے جن کے والدین انھیں طبقاتی تفاوت کی بنا پر الگ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ انجام کار شملی مسعود کی علاحدگی برداشت نہیں کر پاتی ہے اور سخت بیمار ہو جاتی ہے جس کا مداوا صرف مسعود کی رونمائی میں ہوتا ہے۔ پشکر ناتھ کا افسانہ 'اردو کا مارا' غریب کشمیریوں کی سادگی اور رحم دلی کا تصدیق نامہ ہے جب کہ سیاحوں کے من میں یہ بات رچ بس گئی ہے کہ کشمیری تاجر خریداروں کو لوٹتے ہیں۔ سیاحوں سے ہی متعلق ایک اور افسانہ 'کہانی ایک حیا کی' نور شاہ نے رقم کیا ہے جس میں گلمرگ میں گھر کے گھوڑے والوں کی کس مپرسی، ضعیف الاعتقادی اور مفلسی کا دل سوز بیان درج ہے۔ عمر مجید جدید طرز نگارش کے افسانہ نگار ہیں جو علامتوں اور استعاروں کا خوب استعمال کرتے ہیں۔ افسانہ 'گونگے گلاب' نرینہ معصیت والے سماج میں عورتوں اور بچوں پر ہو رہی زیادتیوں اور ان کی نفسیاتی الجھنوں کی کہانی ہے۔ ویریندر پٹواری کا افسانہ 'لالہ رخ' کشمیر کے سیکولر کلچر اور صوفیوں رشیوں کی روایت کا دین ہے۔ افسانے کی 'لالہ رخ' نہ ہندو ہے اور نہ مسلمان بلکہ انسانیت کی علم بردار ہے۔ 'لال ٹیل کا دیوانہ' دیپک کنول کا افسانہ ہے جس میں انسان کی کھینچی سرحدوں کا شاخسانہ بیان کیا گیا ہے کہ کیسے ان مصنوعی لکیروں سے رشتے ٹوٹ جاتے ہیں، اپنے پرائے ہو جاتے ہیں اور وہ پرائے ایک دوسرے کی خاطر اپنی جان تک گنوا بیٹھتے ہیں۔ ترنم ریاض وادی کی بے باک اور باہمت نسوانی آواز ہیں۔ افسانہ 'برف گرنے والی ہے' میں انھوں نے غریب بچوں کی مزدوری پر روک لگانے سے بے روزگاری بڑھنے اور دہشت گردی کی طرف مائل ہونے کو موضوع بنایا ہے۔ دیپک بدکی کا افسانہ 'شیر اور بکرا' محبت و نفرت کی دل سوز کہانی ہے جس میں بات بات پر انسانوں کے فرقوں میں بٹ جانے کی اور پھر ان فرقوں کے درمیان کشت و خون کی، جو بار بار زندگی کی حدیں پار کرتا ہے، داستان سنائی گئی ہے۔ دو فرقوں سے تعلق رکھنے والے میاں بیوی جب گھر بساتے ہیں تو ہمیشہ ان کے من میں تشویش و تذبذب رہتا ہے اور وہ زندگی کی ناکامیوں کو ایک دوسرے کے سر مڑھتے ہیں۔ اس کہانی میں عورت کی لاچاری کو بھی درشایا گیا ہے۔ تاہم وہی جھگڑالو ہم سفر جب ایک دوسرے کو بچھڑتے دیکھتے ہیں تو اپنا روز گار حتیٰ کہ اپنے جسمانی اعضا بھی دوسرے کے لیے قربان کر دیتے ہیں۔ آخری افسانہ غلام نبی شاہد کا افسانہ 'آجادی' ہے جو موجودہ دور کے کشمیریوں کی نفسیاتی ردعمل منعکس کرتا ہے۔

مجھے یقین ہے کہ اس افسانوی مجموعے کا اردو حلقوں میں خیر مقدم ہوگا۔

○○

بقیہ: مشتاق احمد یوسفی

صفحہ ۳ سے آگے

راتیں، سب خواب و خیال ہوگئیں۔ وہ جوان مرگیا، اب تو آپ سنائیے!'' یار کی بات رکھنا تھی۔ خان صاحب نے پشتو کا ایک شعر سنادیا۔

(اے خدا، مجھے گلاب کا پھول بنا دے، کہ میں محبوب کی آغوش میں پتی پتی ہوکر بکھر جاؤں) بوقتِ رخصت ملیشیا کی قمیص پر موتیوں کی مالا بکھر گئی۔ ابدالی پر سر ٹیک کر کہا۔ ''وقت ناوقت ہوا چاہتا ہے، منزل اب دور نہیں، کبھی کبھی موہوم سی خواہش ہوتی تھی کہ اسے (بندوق کو) میرے ساتھ ہی دفن کردیا جائے لیکن کل رات خیال آیا، آپ سے پہلی دفعہ وطن میں ملاقات ہورہی ہے۔ آپ کو اسلحہ جمع کرنے کا شوق بھی ہے، ایک دوست ایک پٹھان کی طرف سے یہ تحفہ قبول کرلیجیے!''

''لیکن ایک شرط پر، آپ میری طرف سے وہ سونے کا تمغہ اتحفہ قبول کرلیں گے جو زندگی میں کسی کام نہ آیا''

اور پھر یوسفی نے سوچا... ''زندگی نے انھیں کیا دیا؟ کچھ بھی تو نہیں، اپنے علاوہ کچھ بھی تو نہیں، مگر ہاں جینے کا ایک نرالا بانکپن، انھوں نے اپنی کج کلہی سے زیست کو معتبر اور محترم بنادیا... اور زندگی کو انھوں نے کیا دیا؟ کتنی خوشیاں، کیسی کیسی خوشبوئیں بکھیرتے چلے گئے کہ آج دامن میں نہیں سماتیں... پھول جو پکھڑ زمین سے لیتے ہیں، اس سے کہیں زیادہ اسے لوٹا دیتے ہیں!''

(باقی آئندہ)

●◆●

بقیہ: اردو ادب پر عربی ادب کے اثرات

صفحہ ۸ سے آگے

حاتم، حیدر کرار، کربلا اور کوہِ طور اور یوم النشور اور اس طرح کے سیکڑوں عربی الفاظ اردو زبان کا جزو بن گئے۔ نمونے کے طور پر اقبال کے یہ اشعار دیکھیے:

تیرا جلال و جمال مردِ خدا کی دلیل
وہ بھی جلیل و جمیل تو بھی جلیل و جمیل
تیری بنا پائدار تیرے ستون بے شمار
شام کے صحرا میں ہو جیسے ہجوم نخیل
تیرے در و بام پر وادی ایمن کا نور
تیرا منار بلند جلوہ گہ جبرئیل

ان اشعار میں پچاس فی صد تک الفاظ عربی زبان کے ہیں۔

اردو شعر و ادب اور تنقید پر عربی ادب کے اثرات کا جائزہ لینے سے پہلے اب ہم یہاں کچھ اردو کے ''الفاظ'' کا تذکرہ بھی کرنا چاہتے ہیں جو اصلاً تو عربی زبان کے الفاظ ہیں لیکن وہ بھیس بدل کر اردو زبان وتہذیب میں گھل مل گئے ہیں۔ کسی چیز کی قیمت کے لیے جب ہم دام کا لفظ استعمال کرتے ہیں تو ہمارے حاشیۂ خیال میں بھی یہ بات نہیں آتی کہ اس لفظ کا کوئی تعلق عربی زبان سے ہے یہ لفظ دام اصل میں درہم ہے جو عربی میں مال اور قیمت کے مفہوم میں استعمال ہوتا ہے اور جب ہم یہ کہتے ہیں کہ ''یہ الماس کیرٹ کا ہوتا ہے'' تو ہمارا ذہن اتنا دقیقہ سنج اور نکتہ شناس نہیں ہوتا کہ عربی لفظ قیراط کی طرف منتقل ہو، اسی طرح سونا کا سکہ اشرفی بھی عربی زبان کا لفظ ہے اور قدیم عربی کتابوں میں اس لفظ کا استعمال ملتا ہے اور جب ہم خوانِ نعم پر بیٹھ کر فیرنی سے کام و دہن کو لذت یاب کرتے ہیں تو ہمارا ذہن ادھر منتقل نہیں ہوتا کہ عربی میں ایک لفظ الفرانی بھی ہے جسے گندھے ہوئے آٹے میں شیر و شکر ڈال کر پکاتے ہیں اور جسے اکثر بیماروں کے سامنے پیش کیا جاتا تھا اب اس فیرنی اور کھیر کو حلوہ کہتے ہیں۔ دسترخوان کے دوسرے کھانے قلیا، کباب اور شوربا بھی اصلاً عربی زبان کے الفاظ ہیں مشروبات میں ایک چیز تاملین ہے یہ اصل میں ایک اسلامی شہر تاملا کی طرف منسوب ہے اور یمن کی ایک معروف شخصیت ابو علی القالی ہے، اسی طرح ہم اردو میں رائج مستری کا لفظ استعمال کرتے ہیں عربی میں ایک لفظ ''ناز'' ملتا ہے جو عمارت کے معمار کے لیے استعمال ہوتا تھا اسی طرح مستری کا لفظ بھی عربی ہے اور اس سے مراد وہ مسطر ہے جو مکان کا معمار دیوار اٹھانے اور اسے برابر کرنے کے لیے استعمال کرتا تھا لکڑی کا کام کرنے والے بڑھئی کے پیشے کے لوگ خراد کرنے کا لفظ استعمال کرتے ہیں یہ بھی عربی لفظ ہے ''خراد'' گھی کرنے کا لفظ اردو زبان میں عام ہے قلع عربی میں اس دھات کو کہتے ہیں جس سے برتنوں پر قلعی کی جاتی ہے پھر اردو میں ایک معروف لفظ تماشا ہے اصل میں یہ عربی تمشّی ہے یہ دوستوں اور ساتھیوں کے ساتھ چہل قدمی کرنے اور چلنے میں لطف لینے کے لیے استعمال ہوتا ہے کیمیا، کتاب، قلم، عنصر اور بیشمار الفاظ ہیں جو اردو میں استعمال ہوتے ہیں۔

اردو زبان میں عربی زبان کے الفاظ بھرے ہوئے ہیں الفاظ کی بڑی تعداد عربی سے مستعار ہے اور صرف الفاظ نہیں بلکہ مکمل عربی تعبیرات اردو ادب میں اور کتابوں میں در آئی ہیں مثال کے طور پر استغفر اللہ، انشاء اللہ، الحمد للہ، سبحان اللہ، الامر فوق الادب، کالنقش فی الحجر، کالعدم۔ شعرا کے نام اور تخلص زیادہ تر عربی زبان کے ہوتے ہیں جیسا سودا، میر، غالب، اقبال، فیض، مجاز۔ پیشوں کے نام بھی عربی سے لیے گئے ہیں جیسے تاجر، طبیب، حکیم، قاضی، امام، استاذ۔ عدلیہ کی اصطلاحیں بھی سب عربی زبان سے آئی ہیں جیسے مدعی مدعی علیہ قانون عدالت شہادت وکیل ارتکاب جرم وغیرہ۔ اب ہم یہاں خاص شعر و ادب اور فن کا تذکرہ کریں گے جس پر عربی زبان کی چھاپ بہت گہری ہے، اردو شعر و نثر میں بلاغت کی اکثر اصطلاحیں، صنائع اور بدائع عربی ادب سے ماخوذ ہیں۔ اردو کے عروض بھی وہی ہیں جو عربی شاعری کے عروض ہیں، خود شعر کا لفظ عربی زبان کا لفظ ہے اور یہ لفظ شعور سے مشتق ہے شعور کا تعلق قلب سے ہے یعنی واردات قلبی کا نام شعور ہے قرآن میں ہے ''الا انهم هم المفسدون ولكن لا يشعرون'' وہ موزوں اور مقفّیٰ کلام جو نفس جذبات ہونے کے ساتھ ساتھ حسن زبان و بیان کا مجموعہ ہوتا ہے شعر کہلاتا ہے۔ اردو شاعری کے فنی محاسن وہی ہیں جو عربی شاعری کے فنی محاسن ہیں، شعر کو صداقت سے قریب ہونا چاہیے صرف خوش بیانی کافی نہیں چنانچہ عربی کا ایک شعر جس کا مفہوم یہ ہے: سچا اور درست شعر وہ ہے کہ جب اسے کوئی شخص سنے تو یہ کہہ کر اٹھے کہ یہ سچی بات ہے۔ عربی کے شعر کی ترجمانی اقبال نے کی ہے:

ہزار خوف ہو لیکن زباں ہو دل کی رفیق
یہی رہا ہے ازل سے قلندروں کا طریق

اور عہد حاضر کے ایک غزل گو شاعر کلیم عاجز نے اپنی ایک غزل کا مطلع اس طرح کہا ہے:

زمانہ سنگ ہستی آئینہ کی خو رکھیو
جو دل میں رکھیو وہی سب کے روبرو رکھیو

اردو ادب میں اخلاقیات کا تصور بھی عربی ادب کی دین ہے۔ اخلاقی عنصر کا تصور لفظ ادب میں خود بخود پایا جاتا ہے یہ تصور انگریزی کے لفظ لٹریچر میں نہیں پایا جاتا لفظ ادب سے یہ بات مستنبط ہوتی ہے کہ صرف اسلوب بیان کا حسین اور دلکش ہونا کافی نہیں بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ مضمون اور معنی بھی مؤدب اور پیرایہ اظہار بھی مؤدب ہو اس لیے، لفظ ادب کے معنوں کا اگر خیال رکھنا ہے تو فحاشی، بے حیائی، بدتہذیبی، بدخلقی یہ سب چیزیں خود بخود دائرۂ ادب سے باہر ہوجائیں گی۔ لفظ لٹریچر میں تو شاید ہر چیز کی گنجائش نکل آئے لیکن لفظ ادب میں اس کی گنجائش نکالنا ادب پر ظلم کرنا ہے، اردو ادب کے کئی ناقدین شبلی، حالی، وحیدالدین سلیم، مولوی عبدالحق، مولانا عبدالسلام ندوی، نیاز فتح پوری اور مسعود حسن رضوی ادیب ادب کے مشرقی تصور کے قائل تھے اور ادب کا مشرقی تصور عربی ادب و فارسی ادب کی دین ہے۔ فارسی ادب کا نقطۂ نظر بھی عربی ادب سے ماخوذ ہے بلاغت، لوازم بلاغت اور فن بلاغت کی بہت سی چیزیں عربی ادب سے اردو ادب میں آئی ہیں۔ فن بلاغت پر عبدالقاہر جرجانی کی کتاب 'دلائل الاعجاز' اور قدامہ بن جعفر کی کتاب 'نقد الشعر' اور ابن رشیق کی کتاب 'العمدۃ' نے شبلی و حالی کے تنقیدی تصورات پر بڑا گہرا اثر ڈالا ہے۔ شاعری کی جانچ و حسن کا معیار وہی ہے جو عربی ادب کے قدیم ناقدین نے متعین کردیا ہے۔

'مقدمہ شعر و شاعری' مثال کے طور پر حالی کے تنقیدی نظریات کا مجموعہ ہے، حالی نے اپنے تنقیدی نظریات میں ابن خلدون سے بھی استفادہ کیا ہے، عربی تنقید نگاروں کا اس پر خاصا اختلاف ہے کہ شاعری اور انشا پردازی میں عمدگی کا انحصار الفاظ پر ہے یا معانی پر، حالی نے اس موضوع پر جو گفتگو کی ہے اس سے یہ بات مترشح ہوتی ہے کہ ان کے نزدیک الفاظ کے انتخاب کی اہمیت زیادہ ہے، وہ مقدمہ ابن خلدون کے آخری حصے سے ایک اقتباس نقل کرتے ہیں:

''الفاظ کو ایسا سمجھو جیسے پیالہ کو، اور معانی کو ایسا سمجھو جیسے پانی، پانی کو چاہو سونے کے پیالہ میں بھرلو اور چاہو چاندی کے پیالہ میں، اور چاہو کانچ یا بلور یا سیپ کے پیالہ میں اور چاہو مٹی کے پیالہ میں، پانی کی ذات میں کچھ فرق نہیں آتا مگر سونے یا چاندی کے پیالہ میں اس کی وقعت بڑھ جاتی ہے اور مٹی کے پیالہ میں کم ہوجاتی ہے اسی طرح معانی کی قدر ایک فصیح اور ماہر کے بیان میں زیادہ ہوجاتی ہے اور غیر فصیح کے بیان میں گھٹ جاتی ہے''۔

حالی نے 'مقدمہ شعر و شاعری' میں لفظ کی آرائش کو معنی کی آرائش پر ترجیح دی ہے اسی بات کو سودا نے اپنے شعر میں اس طرح کہا ہے:

کامل فن سخن کہتے ہیں اس کو اکمل
پرورش لفظ کی ہو منظور جس کو اول

حالی کی 'مقدمہ شعر و شاعری' کا، شبلی نعمانی کی 'شعر العجم' کا اور شبلی کی دوسری کتاب 'موازنۂ انیس و دبیر' کا اور 'مقالات شبلی' میں بلاغت پر شبلی کے مضمون کا گہرائی کے ساتھ اگر مطالعہ کیا جائے تو بہت آسانی کے ساتھ اندازہ ہوسکتا ہے کہ اردو شعر و ادب اور تنقید پر عربی ادب کے کتنے گہرے اثرات پڑے ہیں۔

(مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں یہ مضمون پڑھا گیا)

◆◆

اردو ادب پر عربی ادب کے اثرات

پروفیسر محسن عثمانی ندوی (شعبۂ عربی، سی آئی ای ایف ایل، حیدرآباد)

ادب کا ایک خاص مفہوم ہوتا ہے جس سے مراد اعلا ادب ہے کی فنکارانہ نثر اور اعلا درجے کی شاعری ہے۔ فکشن یعنی قصے اور ناول بھی اسی ذیل میں آتے ہیں۔ ادب کا ایک دوسرا عمومی مفہوم ہے جو جنرل لٹریچر کے مفہوم میں استعمال ہوتا ہے جیسے حدیث کا لٹریچر، تفسیر کا لٹریچر، اسلامیات کا لٹریچر، سائنس کا لٹریچر وغیرہ وغیرہ۔ ادب اپنے دونوں مفہوم کے لحاظ سے عربی ادب سے متاثر ہے یعنی اردو ادب میں عربی ادب کے عمومی مفہوم کے لحاظ سے بھی بہت کچھ مواد موجود ہے اور ادب کے فنی مفہوم کے لحاظ سے بھی اردو ادب نے عربی ادب سے استفادہ کیا ہے۔ پہلے ہم ادب کے عمومی مفہوم کو لیتے ہیں تو ہمیں اندازہ ہوگا اردو زبان کا خزانہ علمی عربی ادب کے زیر اثر علوم اسلامی سے مالا مال ہے۔ عربی زبان کے بعد اسلامیات پر کسی زبان میں اتنی کتابیں نہیں لکھی گئیں جتنی اردو زبان میں لکھی گئی ہیں۔ مثال کے طور پر تفسیر کا لٹریچر عربی ادبیات کے دائرے میں آتا ہے بروکلمان نے جو عربی ادب کی تاریخ لکھی ہے اس میں بھی تفسیر و حدیث کی کتابیں آگئی ہیں۔ 'تاریخ التراث العربی' میں بھی تفسیری لٹریچر، اسلامیات کے لٹریچر وغیرہ کا تذکرہ ہے۔ اس سے ثابت یہ ہوا کہ ادب کے عمومی مفہوم میں پورا اسلامیات کا لٹریچر آجاتا ہے۔ اس اعتبار سے اردو ادبیات کے خزانے میں اسلامیات کا وہ سارا لٹریچر تقریباً موجود ہے جو عربی ادبیات کا بیش قیمت سرمایہ ہے صرف عہد حاضر کی تفسیر کی کتابوں کو آپ دیکھیں تو ان میں مولانا ابوالکلام آزاد کی تفسیر ترجمان القرآن ہے، مولانا اشرف علی صاحب کی تفسیر بیان القرآن ہے، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی 'تفہیم القرآن' ہے، مولانا امین احسن اصلاحی کی تدبر قرآن ہے، مولانا مفتی محمد شفیع کا ترجمہ و تفسیر ہے، تفسیر مظہری ہے، موضح القرآن ہے، ظاہر ہے کہ تفسیر کے موضوع پر بے شمار کتابیں ہیں جو عربی زبان و ادب میں موجود تفسیر کی کتابوں کے زیر اثر لکھی گئی ہیں۔ اسی طرح سے عربی اسلامی لٹریچر کے زیر اثر ہندستان میں حدیث پر بہت کام ہوا ہے اردو زبان میں صحیح بخاری، صحیح مسلم، جامع ترمذی، ابوداؤد، مشکوٰۃ المصابیح اور ریاض الصالحین کے ترجمے ہوئے اور یہ ترجمے اردو میں اسلامی لٹریچر کا مطالعہ کرنے والوں میں بہت زیادہ مقبول ہوئے۔ مولانا بدر عالم میرٹھی کی کتاب اردو میں کئی جلدوں میں 'ترجمان السنۃ' ہے جس کا حدیث کے اردو لٹریچر میں خاص مقام ہے اسی طرح سے مولانا محمد منظور نعمانی کی کتاب 'معارف الحدیث' ہے، یہ کتاب بھی کئی جلدوں میں ہے اور اس کتاب کی مقبولیت کا آفتاب آج بھی نصف النہار پر ہے۔

اسی طرح سے عربی ادبیات کے ذخیرے میں سیرت نبوی پر کتابیں قدیم سے لے کر عہد حاضر تک لکھی گئی ہیں اور لکھی جا رہی ہیں اور یہ سلسلہ کبھی نہ ختم ہونے والا سلسلہ ہے اور سیرت کا موضوع سدا بہار ہے جس کی تازگی اور شادابی کبھی ختم نہیں ہوتی۔ سیرت کی جو کتاب علمی اور ادبی اعتبار سے بہت زیادہ مقبول اور مشہور ہوئی وہ علامہ شبلی اور علامہ سید سلیمان ندوی کی 'سیرت النبیؐ' ہے۔ یہ کتاب علامہ شبلی کی تصنیفی زندگی کی آخری کتاب ہے انھوں نے اپنی وفات سے پہلے ایک الہامی قطعہ کہا تھا وہ ان کے حسن خاتمہ کی دلیل ہے اور ان کے لوح مزار پر بھی اشعار لکھے ہوئے ہیں:

عجم کی مدح کی عباسیوں کی داستاں لکھی
مجھے چندے مقیم آستان غیر ہونا تھا
مگر اب لکھ رہا ہوں سیرت پیغمبر خاتم
خدا کا شکر ہے یوں خاتمہ بالخیر ہونا تھا

'سیرت النبیؐ' میں علامہ شبلی نے بعض مقامات پر نثر میں اردوئے معلی کا نمونہ پیش کیا ہے اور ایسی تحریر لکھی ہے جسے اردو کی بہترین اردو تحریروں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ ظہور قدسی کا تذکرہ کرتے وقت علامہ شبلی کا قلم رقص میں آ گیا اور ہر ہر لفظ سے جوش و سرمستی کا اظہار ہوا۔ علامہ شبلی کی تحریر درج ذیل ہے:

"چمنستان دہر میں بارہا روح پرور بہاریں آچکی ہیں، چرخ نادرہ کار نے کبھی کبھی بزم عالم اس سروسامان سے سجائی ہے کہ نگاہیں خیرہ ہو کر رہ گئی ہیں لیکن آج کی تاریخ وہ تاریخ ہے جس کے انتظار میں پیر کہن سال دہر نے کروڑوں برس صرف کر دیے، سیارگان فلک اسی دن کے شوق میں ازل سے چشم براہ تھے، چرخ کہن مدت ہائے دراز سے اسی صبح جاں نواز کے لیے لیل و نہار کی کروٹیں بدل رہا تھا، کارکنان قضا و قدر کی بزم آرائیاں، عناصر کی جدت طرازیاں، ماہ و خورشید کی فروغ انگیزیاں، ابر و باد کی تردستیاں، عالم قدس کے انفاس پاک، توحید ابراہیم، جمال یوسف، معجز طرازی موسیٰ، جاں نوازی مسیح، سب اسی لیے تھے کہ یہ متاع ہائے گراں... شہنشاہ کونین کے دربار میں کام آئیں گے..."

یہ تو شبلی اور سلیمان ندوی کی 'سیرت النبیؐ' کا ذکر خیر تھا اس کے علاوہ بھی سیرت کے لٹریچر کے خزانے میں ایک سے ایک گوہر آبدار اور لعل بدخشاں موجود ہیں۔ قاضی سلیمان منصور پوری کی 'رحمۃ للعالمین'، ماہر القادری کی 'در یتیم'، مولانا ادریس کاندھلوی کی 'سیرت مصطفیٰ'، نعیم صدیقی کی 'محسن انسانیت'، مولانا ابوالحسن علی ندوی کی 'نبی رحمت'، علامہ سید سلیمان ندوی کی 'رحمت عالم' اور 'خطبات مدارس'، ڈاکٹر حمید اللہ کی 'خطبات بہاولپور' اور بے شمار سیرت کی کتابیں ہیں جسے آسانی کے ساتھ گنا نہیں جا سکتا۔ یہ سب اردو کے سیرت کے لٹریچر کی بہترین کتابیں ہیں اور "ہر گل را رنگ و بوئے دیگر است" کے مصداق ہر کتاب کا ایک نیا انداز اور ہر کتاب کی ایک نئی خوشبو ہے بقول شاعر:

نیا ہے لیجیے جب نام ان کا
بڑی وسعت ہے ان کی داستاں میں

عربی ادبیات کے زیر اثر تاریخ اسلام پر بھی بہت ساری کتابیں لکھی گئی ہیں اور اسلامیات کا کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جس میں اردو زبان و ادب میں پھول نہ کھلائے گئے ہوں اسی لیے اردو کا لٹریچر اسلامیات سے مالا مال ہے اور عربی اسلامی ادب کا پرتو ہے تو اردو ادب کے قلم رو میں عربی اسلامی ادب کا پورا اقلیم سخن آ گیا ہے۔

اب تک اردو لٹریچر میں خاص طور پر نثر میں عربی اسلامی ادب کے انعکاسات کا تذکرہ تھا اب اردو شعر و ادب میں عربی شعر و نقد کے انعکاس کے بارے میں بھی تذکرہ بہت ضروری ہے۔ چوں کہ ادب کے پھول زبان کے چمن میں کھلتے ہیں اسی لیے شعر و ادب سے پہلے اردو زبان پر عربی زبان کے کیا اثرات پڑے ہیں اس کی طرف بھی اشارہ کرنا ضروری ہے۔ جو لوگ اردو زبان کی تاریخ سے واقف ہیں انھیں علم ہے کہ اردو میں عربی اور فارسی دونوں کی بہت زیادہ آمیزش رہی ہے۔ کئی سو سال پہلے مسلمانوں کے عہد حکومت میں انتظامی کاموں کی زبان اور علمی کاموں کی زبان فارسی تھی۔ حکومت کے عملہ کا جب عوام سے ملنا جلنا ہوتا تھا تو وہ عوام کی زبان بولتے تھے جس میں فارسی الفاظ داخل ہو جاتے تھے اور چوں کہ فارسی میں عربی کے الفاظ بہت کثرت سے داخل تھے اس لیے عربی کے الفاظ خود بہ خود عوامی زبان میں داخل ہوتے چلے گئے۔ علمائے دین کو بھی وعظ و تقریر کے لیے عوام کی زبان اختیار کرنی پڑتی تھی اور مذہبی گفتگو یا تقریر میں عربی زبان کے الفاظ کا استعمال بہت زیادہ ہوتا تھا اس لیے باقاعدہ ایک عوامی زبان کی بنیاد پڑتی چلی گئی جس کا نام بعد میں اردو ہو گیا۔ عربی زبان کے الفاظ زیادہ تر فارسی زبان کے ذریعے اس میں داخل ہوئے اور کچھ براہ راست بھی۔ عربی زبان کے دینی اور ادبی قصے، ان کی تلمیحات سب اردو میں داخل ہو گئیں۔ مجنوں و لیلیٰ، موسیٰ اور عصائے موسیٰ، حاتم

(بقیہ صفحہ [illegible] پر)

مدیر: اطہر فاروقی
شریک مدیر: محمد عارف خاں
پرنٹر پبلشر: شاہد خاں — مطبوعہ: شمر آفسٹ پرنٹنگ پریس، دہلی
مالک: انجمن ترقی اردو (ہند)، اردو گھر ۲۱۲، راؤز ایونیو، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲
قیمت (فی شمارہ): دو روپے، سالانہ: ۸۵ روپے (بیرونی ممالک: آٹھ امریکی ڈالر)
Phones: 23237212, 23237214
E-mail: hamarizaban@atuh.org
http://www.atuh.org